مولانا مودودیؒ

کی

ادبی خدمات

پروفیسر عبدالمغنی

ترتیب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیشِ لفظ

تقریباً پچیس سال قبل میں نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے ادبی اسلوب پر ایک مختصر تنقیدی مضمون لکھا تھا، جس کا تذکرہ پروفیسر خورشید احمد نے اپنی مرتبہ ''ادبیات مودودی'' کے مقدمے میں کیا ہے۔ یہ مضمون مولانا مودودیؒ کی زندگی میں لکھا گیا تھا اور شائع بھی ہوا تھا، گرچہ مجھے یاد نہیں کہ کس رسالے کی کس اشاعت میں یہ مضمون شائع ہوا تھا، ممکن ہے وہ ''چراغِ راہ'' کراچی، ''سیارہ'' لاہور یا ''دوام'' ٹانڈہ (فیض آباد) ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان رسائل میں سے کسی ایک میں شائع ہو کر باقی میں نقل کیا گیا ہو۔ بہ ہر حال، بروقت یہ مضمون میرے پاس محفوظ نہیں، نہ یہ میرے کسی مجموعۂ مضامین میں اب تک شامل ہو سکا ہے۔

مولانا مودودی کی ولادت ۱۹۰۳ میں ہوئی اور وفات ۱۹۷۹ میں۔ انھوں نے ۱۹۲۰ کے آس پاس مضمون نویسی شروع کر دی تھی۔ اس طرح اپنی چھہتر (۷۶) سال کی عمر میں مولانا نے تقریباً ساٹھ سال تصنیف و تالیف میں گزارے۔ اپنی ادبی زندگی کا آغاز انھوں نے صحافت سے کیا، لیکن بہت جلد انھوں نے علمی مضامین لکھنے شروع کر دیے اور مستقل کتابیں بھی تحریر کیں۔ ابتدا میں کچھ کام تراجم، سوانح اور تواریخ کے بھی کیے مگر اپنی تصنیفی زندگی کی پہلی دہائی میں ان کاموں سے وہ فارغ ہو گئے۔ جب کہ دوسری دہائی میں ۱۹۳۳ سے ''ترجمان القرآن'' کی ادارت کے ساتھ انھوں نے ایک تحریک کے ساز و برگ مہیا کرنے پر اپنی توجہ مرکوز کر دی اور پھر پچاس سال کی طویل مدت میں ان کے طاقت ور قلم نے وہ عظیم الشان تحریکی لٹریچر تخلیق کیا، جس سے بہتر فکری سرمایہ عصرِ حاضر کی کسی زبان اور اس کے ادب میں نہیں پایا جاتا۔

میں پچھلے تیس چالیس سال سے مسلسل مولانا مودودیؒ کی تحریروں کا مطالعہ کرتا رہا ہوں

اوران کے علم وفکر کے ساتھ ساتھ ان کی زبان اور طرز نگارش نے بھی مجھے متاثر کیا ہے۔اس تاثر کا پہلا تنقیدی اظہار تو میں نے اپنے مذکور بالا گم شدہ اردو مضمون میں کیا تھا، جب کہ حال ہی میں ''ریڈینس'' دہلی کے مولانا مودودی نمبر میں دوسرا تنقیدی مضمون میں نے انگریزی میں The Style of Maudoodi کے عنوان سے تحریر کیا۔اب یہ کتاب لکھ کر کسی حد تک وہ فرض ادا کرنا چاہتا ہوں جو میرے ذہن پر مولانا مودودیؒ کے افکار و اسلوب کا ہے۔اس کتاب کی تصنیف کا محرک میری یہ تنقیدی رائے ہے کہ جس طرح شاعری کا بہترین نمونہ اقبال کا کلام ہے اسی طرح نثر کا بلندترین معیار مولانا مودودیؒ کا طرز نگارش ہے۔

عبدالمغنی

ادب کا مفہوم

ادب کا یہ تصور بالکل غلط ہے کہ وہ معروف تخلیقی اصناف تک محدود ہے، خاص کر نثر کے سلسلے میں یہ تحدید نہ ممکن ہے نہ معقول۔ افسانہ وناول، ڈراما، انشائیہ اور تنقید ادب کی معروف اصناف ہیں، لیکن نثری ادب کے اعلیٰ نمونے ان اصناف سے ہٹ کر بھی پائے جاتے ہیں اور تاریخِ ادب نے ان کی اہمیت کو تسلیم بھی کیا ہے۔ فلسفہ والٰہیات سے لے کر سیاسیات ومعاشیات تک مختلف موضوعات پر ادبی پیرائے میں اظہار خیال کیا گیا ہے۔ علم اور ادب کا رشتہ بہت قریبی ہے۔ فنون کے ساتھ ساتھ علوم کے مطالعات وتجربات کی ترسیل بھی ادب ہی کے ذریعے ہوتی ہے۔ کسی زبان میں ہر قسم کے خیالات کا ابلاغ ہوتا ہے، یہاں تک کہ اصلاح وانقلاب کی تبلیغ بھی ہوتی ہے۔ یہ تبلیغ اپنی تاثیر اسی وقت قائم کرسکتی ہے جب وہ بہترین اسلوب سے کی گئی ہو، اس لیے کہ افہام وتفہیم کے لیے طرز بیان کی عمدگی ضروری ہے اور حسنِ بیان اور زور بیان کے بغیر افکار کی اشاعت نہیں ہوسکتی۔

انگریزی کے مشہور ادیب جارج برنارڈ شا نے اپنے شہرۂ آفاق ڈرامے 'مَین اینڈ سُو پر مَین' کے دیباچے میں بالکل صحیح کہا ہے کہ جو شخص اپنے خیالات کی تبلیغ کرنی چاہے گا وہ اچھے سے اچھا پیرایۂ اظہار اختیار کرے گا اور اس کا مقصد جتنا وقیع ووسیع ہوگا وہ اپنے اسلوبِ بیان کو اتنا ہی حسین، پُرزور اور پُراثر بنائے گا۔ اس طرح بہترین مقاصد کی تبلیغ بہترین ادب پیدا کرسکتی ہے اور کرچکی ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ مبلغ یا مصلح کے کام کا ایک حصہ جہاں بہترین موادِ فکر کا حصول ہے وہیں بہترین ہیئت اظہار کی تشکیل بھی اور جو مبلغ یا مصلح بیک وقت یہ دونوں کام پوری ہم آہنگی کے ساتھ انجام نہیں دے سکتا وہ اپنے مشن میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوسکتا۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو فنون کی طرح علوم کے مباحث میں بھی پیغام (Message) اور وسیلے (Medium) کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں رہتا، دونوں ایک دوسرے میں ضم ہو کر ہی ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اس نظام کے لیے ضروری نہیں کہ ہم مغربی تنقید کے محاورے میں یہ کہیں کہ وسیلہ ہی پیغام ہے: Medium is the message۔ بلکہ ہم اس کے برعکس بھی کہہ سکتے ہیں کہ پیغام اپنا وسیلہ خود تلاش کر لیتا ہے:

The message seeks its own medium

بہ ہر حال، اصل اہمیت پیغام کی ہے اور وسیلے کی اہمیت پیغام کی اہمیت پر مبنی ہے یا منحصر ہے، جس کے پاس کہنے کی کچھ باتیں ہوتی ہیں وہ اپنی باتیں موزوں طریقے پر پیش کرتا ہے۔ لہٰذا ادب کا مفہوم بہت وسیع ہے اور اس میں مقصدی وافادی تحریریں بھی شامل ہیں۔

اردو نثر کی روایات

اردو زبان کے نشو ونما میں صوفیائے کرام کا حصہ تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے۔ یہ سب صوفیا بالعموم علمائے دین اور مبلّغین تھے۔ ان کے ملفوظات کا مقصد لوگوں کی اصلاح و ہدایت تھی۔ لیکن اصلاح وہدایت کا یہ کام لسانی تشکیل کے دور میں ہوا، جب ملک کے مختلف علاقوں میں فارسی وعربی اور مقامی پراکرتوں کی آمیزش سے زبانِ اردو کا خمیر اٹھ رہا تھا۔ اس کے بعد ادبی دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ میر امن سے رجب علی بیگ سرور تک اردو نثر میں افسانے لکھے جاتے رہے، پھر غالب نے خطوط میں انشاء پردازی کے جوہر دکھائے۔ اردو کی علمی نثر کا آغاز صحیح معنی میں سرسید سے ہوتا ہے۔ ان کے مضامین نہ صرف اصلاحی وتہذیبی خیالات سے پُر ہیں بلکہ اپنا ایک صاف وسلیس اسلوبِ بیان بھی رکھتے ہیں۔ ان مضامین میں افکار کی وسعت ورفعت، اظہار کی سادگی وروانی کے ساتھ ظاہر ہوئی ہے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ادبی معیار کی علمی نثر کا معتبر اوّلین نمونہ اردو میں سرسید کی تحریر ہے۔

لیکن سرسید کی نثر پورے طور پر ہموار و استوار نہیں۔ اس کی بے ساختگی میں پرداختگی کی کمی ہے اور غالب کے خطوط کا حسنِ بیان بھی اس میں نہیں پایا جاتا۔ سرسید کے ہم عصروں میں مولانا الطاف حسین حالی کی نثر ایک بہتر کوشش ہے، اس لیے کہ وہ کچھ زیادہ مرتب ہے، مگر اس پر سرسید کا اثر بہت زیادہ نمایاں ہے۔ سادگی وسلاست کے باوجود حالی کی نثر میں نہ صرف انگریزی الفاظ کا بے محابا استعمال روانیِ بیان میں خلل انداز ہوتا ہے، بلکہ جا بہ جا ثقیل ونامانوس عربی الفاظ بھی عبارت کی سلاست کو مجروح کرتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ سرسید کی طرح حالی نے بھی اپنے اسلوب کی تعمیر پر زیادہ توجہ صرف نہیں کی اور محض بے تکلفی کو کافی سمجھا۔

اس کے برخلاف مولانا محمد حسین آزاد نے اپنے طرزِ نگارش کی آرائش پر پوری توجہ دی، مگر زیبائش کی فکر ان کے یہاں بسا اوقات تصنع کی حد تک پہنچ جاتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نثر میں شاعری کے انداز ابھرنے لگتے ہیں، اس کے علاوہ آزاد کو افسانہ طرازی اور تمثیل نگاری کی عادت بھی ہے، لہٰذا ان کی نثر محکم اور حکیمانہ انداز اختیار کرنے سے قاصر رہی، اس کی اسلوب پرستی علمی مضامین کے موزوں طرز بیان میں حائل ہوتی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد بھی زبان و بیان میں آراستگی کی فکر کرتے ہیں، مگر وہ شاعری کے بہ جائے محاورہ بندی کے رسیا ہیں، جس کے سبب کچھ لطف کے ساتھ ساتھ لفّاظی کا بھی احساس ہوتا ہے اور وہ متانت مجروح ہوتی ہے جو ایک علمی نثر کا طرۂ امتیاز ہے۔ دراصل نذیر احمد اصلاً اور واقعتاً ایک افسانہ نگار ہیں، لہٰذا محاورۂ زبان کو ہی اسلوبِ بیان کی سب سے بڑی خوبی سمجھتے ہیں۔ یہ طرز پرستی فصاحت و بلاغت دونوں کے فروغ و عروج میں مزاحم ہوتی ہے۔

شبلی کی نثر نے اردو ادب میں فصاحت و بلاغت کا ایک اعلیٰ معیار قائم کیا۔ انھوں نے متنوع عالمانہ و محققانہ تصانیف ایک شستہ و شگفتہ زبان میں پیش کیں۔ ان کے حکیمانہ خیالات ایک ایسی نفاست و متانت کے ساتھ سامنے آئے جس میں پرداختگی کے باوجود بے ساختگی ہے۔ عربی و فارسی کے اپنے وقت میں سب سے بڑے عالم ہونے کے باوجود شبلی نامانوس اور ثقیل الفاظ و تراکیب استعمال نہیں کرتے، ان کے جملے بہت صاف و صریح ہوتے ہیں اور ان کی عبارت نہایت محکم، ہموار اور استوار ہوتی ہے۔ شبلی کا اسلوبِ بیان اردو کی ادبی نثر کا نمونۂ کمال ہے۔

شبلی کے عالمانہ ادب نے ایک دارالمصنفین کی راہ ہموار کی اور ان کے طرز پر لکھنے والوں کا ایک پورا حلقہ پیدا ہو گیا، جس کے نمایاں ترین ارکان مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی ہیں۔ اس حلقے نے اردو نثر میں صوفیا، علماء اور مجاہدین و مبلغین کے عظیم الشان ورثے کو ترقی دے کر ایک مستقل مکتبِ ادب کی شکل دے دی، جس سے وابستہ افراد نے بہت بڑے پیمانے پر تصنیف و تالیف کی وقیع خدمات انجام دیں۔ ان خدمات کا اثر اردو زبان و ادب پر کثرت و وسعت کے ساتھ پڑا، یہاں تک کہ شبلی کے حلقۂ فکر سے باہر بھی جو محققین و ناقدین ابھرے ان کے طرز تحریر پر شبلی کے اسلوب کی چھاپ ان کے ہم عصروں کے اسالیب سے زیادہ گہری پڑی۔ مثال کے طور پر عبدالحق، سر سید اور حالی کے مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے ہیں، مگر ان کا طرز نگارش شبلی سے متاثر ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے طرزِ تحریر کے کئی ادوار ہیں، لسان الصدق کے دور میں جو سادگی و بے تکلفی ہے وہ الہلال کے دور میں جزالت و شوکت میں بدل جاتی ہے، لیکن ترجمان القرآن اور غبارِ خاطر کا دور سلاست و نفاست کا نمونۂ کمال پیش کرتا ہے، اور یہی مولانا آزاد کا حقیقی اسلوب ہے، جس میں انھوں نے اردو کی بہترین نثر اسی معیار پر لکھی جو شبلی نے قائم کیا تھا۔ اس نثر میں متانت کے ساتھ ظرافت کی چاشنی بھی ہے، سنجیدگی کے ساتھ شگفتگی اور انضباط کے ساتھ انبساط بھی ہے۔ یہ ایک تجزیاتی اسلوب ہے جس میں ایک ایک نکتے کی وضاحت کر کے ہر موضوع کے تمام مضمرات و اشارات کی تشریح، ایک ترتیب کے ساتھ، منظم طور پر منطقی انداز سے کی جاتی ہے اور پڑھنے والا محسوس کرتا ہے کہ معانی و مفاہیم کی گرہوں پر گرہیں کھلتی چلی جارہی ہیں، پھر زورِ بیان ایسا ہے کہ قاری کا ذہن اس رو پر بہتا چلا جاتا ہے جو مصنف کی عبارت میں بجلی کی طرح دوڑ رہی ہوتی ہے۔ اس برقی اثر کے پیدا کرنے میں اسماء وصفات سے زیادہ ان افعال کا دخل ہے جو مصنف بہ کثرت استعمال کرتا ہے۔ یہ ایک نہایت متحرک و مؤثر طرزِ تحریر ہے، جس سے وہ تبلیغی مقاصد بہ درجۂ اتم پورے ہوتے ہیں جو مصنف کے پیشِ نظر ہیں۔

اردو نثر کی روایات کا یہ سرمایہ بہ یک وقت علمی و ادبی دونوں ہے، اس لیے کہ اس میں علم کی ثروت کے ساتھ ساتھ ادب کی لطافت بھی ہے۔ ہمارے علمائے ادب کے پاس نہ صرف یہ کہ معلومات کا ایک بحرِ ذخار ہے بلکہ لسانی وسائل کا ایک انبار بھی، وہ جس درجہ تمدنی و تہذیبی علوم و فنون کی واقفیت رکھتے ہیں اسی درجہ انہیں زبان و بیان کے ذرائع اظہار پر بھی قدرت ہے، وہ انگریزی جتنی بھی جانتے ہوں یا بالکل نہیں جانتے ہوں، عربی و فارسی کے وہ ماہر تھے اور کھڑی بولی کے محاورات بھی ان کی دست رس میں تھے۔ مشرقی طرزِ بیان پر ان کا یہ قابو ان کے اسلوب کی طاقت اور خوب صورتی کا سب سے بڑا راز ہے۔ اردو کے یہ صاحبِ طرز ادباء ہی ہمارے نثری ادب کی وہ زریں روایت بناتے ہیں، جس کی توسیع و ترقی بعد کے ادوار میں مختلف اصنافِ ادب کے اندر ہوتی رہی ہے۔

نثر میں اردو ادب کی بہترین روایات جس دور میں قائم ہوئیں وہ ہندستان، مشرق اور عالم اسلام کی نشأۃِ ثانیہ اور اصلاح (Renaissance and Reformation) کا وہ دور تھا جو ایشیا و افریقہ اور ہندستان پر مغربی بالخصوص برطانوی سامراج کے مکمل تسلّط کے بعد شروع

ہوا۔ اس عہد میں علمی و ادبی اور تہذیبی و ثقافتی اقدار کے تحفظ و ترقی کے لیے اردو دنیا میں جو شخصیتیں ابھریں وہ قاموسی ذہن رکھتی تھیں اور مغرب کے قاموسیوں (Encyclopaedists) سے کسی طرح کم نہیں تھیں، بلکہ ان سے کچھ زیادہ ہی وسیع النظر اور صاحب علم تھیں، اس لیے کہ قدیم مشرق کے ساتھ ساتھ قدیم مغرب کا بھی فاضلانہ مطالعہ انھوں نے عربی کے ذریعے کیا تھا اور اسلام کے شیدائی ہونے کے باوجود عیسائیت کے خلاف کوئی تعصب ان کے دلوں میں نہیں تھا، جب کہ اہلِ مغرب کے درمیان مستشرقین (Orientalists) کا ایک طبقہ پیدا ہی اس لیے ہوا تھا کہ یورپ کے عیسائیوں کے سامراجی عزائم کی تکمیل کے لیے ایشیا بالخصوص اسلام کی تعلیمات و ترقیات کو پورے طور پر مسخ کر کے دکھائے۔

اس سلسلے میں ایک بہت اہم واقعہ یہ ہے کہ تیرہویں سے سترہویں صدی تک یورپ کے مختلف ممالک میں نشاۃِ ثانیہ اور اصلاح کی جو تحریکیں چلیں ان سب کا منبع براہ راست عہدِ وسطیٰ کا اسلامی معاشرہ، مسلم تہذیب و تمدن اور عربوں کی علمی فتوحات تھیں، یہاں تک کہ قدیم یونان و روم کے علوم و فنون کا ورثہ بھی اہل مغرب کو زوال پذیر یونانیوں اور رومیوں سے نہیں، ترقی یافتہ عربوں اور مسلمانوں سے ملا، خاص کر اسپین کی یونیورسٹیوں اور کتب خانوں نے مسلمانوں کے علمی و فنی کمالات کا سبق یورپ کے عیسائیوں کو سکھایا۔ لیکن احسان فراموش شاگردوں نے مذہبی تعصّبات سے اندھے ہو کر اپنے استادوں کی تعلیمات سے مکمل استفادے کے باوجود نہ صرف یہ کہ بالعموم ان کی اہمیت کا اقرار نہیں کیا بلکہ بسا اوقات انہیں مسخ کر کے ان کا مذاق اڑایا۔ مغربی ادب میں اس تاریک خیالی کا امام گردانتے تھے، جس کی جاہلانہ تصنیف طربیۂ خداوندی (Divine Comedy) کو خاص کر اس کی اسلام دشمنی کے سبب مغربی نقادوں نے شاعری کی انجیل بنا دیا۔

انیسویں صدی کے اردو قاموسیوں کو، انگریزی یا کسی اور مغربی زبان سے ناواقف یا بہت کم واقف ہونے کے سبب، اہل مغرب کی فتنہ پردازیوں کی بہت زیادہ خبر نہیں تھی، گرچہ سرسید کی دینی حمیت اور ایک انگریز مصنف کی سیرتِ رسولؐ کو مسخ کرنے کی جاہلانہ کوشش نے ان سے ایک زبردست جواب ''خطباتِ احمدیہ'' لکھوایا اور شبلی نے تو اپنی متعدد تصانیف کے ذریعے اہل مغرب کی تاریخی جہالتوں کا پردہ چاک کر دیا۔ لیکن کچھ تو مغرب کے سیاسی اقتدار اور تمدنی

غلبے کے سبب اور کچھ اس کی علمی خباثتوں سے پوری طرح آگاہ نہ ہونے کے باعث، بلکہ سب سے زیادہ اپنی وسعتِ نظر اور کشادہ دلی کی وجہ سے، اردو نثر کی ادبی روایات کے بانیوں نے نہ صرف یہ کہ مغربی ادبیات کے اسلوب و انداز سے بالواسطہ استفادہ کیا، بلکہ ان میں بعض نے ''پیروئِ مغربی'' کی تلقین بھی کی۔ بہ ہر حال، اردو ادب پر مغربی ادبیات کے اولین اثرات اس طرح نہیں پڑے کہ فقط ان ادبیات کی نقالی ہو جائے، اس لیے کہ جن ذہنوں نے یہ اثرات قبول کیے وہ بہت پختہ، بالغ، بالیدہ اور قوی تھے، چنانچہ ان کے پاس اپنا ایک معیارِ اقدار تھا، ایک تہذیبی نقطۂ نظر تھا، ایک اجتماعی نصب العین تھا، سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے علمی و ذہنی سرمایے ان کے شعور و کردار کا ایک مضبوط سانچہ بنا چکے تھے۔ لہٰذا اردو کے اوّلین قاموسیوں نے نشاۃٔ ثانیہ اور اصلاح کے مقاصد کو سامنے رکھ کر جو ادب پیدا کیا اس کے اندر اصلیت تھی، خلوص تھا اور سلیقہ بھی۔ اسی لیے اس ادب میں غیروں کی تقلید سے زیادہ اپنی روایات میں اجتہاد کا رنگ تھا۔

اس اجتہاد سے اردو نثر کو بہت زیادہ فائدہ ہوا اور یہ ایک علمی زبان بن کر ادب کے اعلیٰ معیار تک پہنچ گئی، یہاں تک کہ اس نے ایک ہی عہد میں متعدد صاحب طرز ادباء پیدا کیے، حالی، شبلی، محمد حسین آزاد، نذیر احمد، ابوالکلام آزاد سب کے اسالیب بیان جداگانہ ہیں۔ ان میں آخر الذکر بیسویں صدی کے اوائل میں نمایاں ہوئے، لیکن ان کی ذہنی تربیت انیسویں صدی کے اواخر میں انہی اساتذۂ ادب کے درمیان ہوئی جن کی بیشتر تحریریں گزشتہ صدی میں نمودار ہوئی تھیں۔

مولانا مودودیؒ بحیثیت ادیب

تناظر

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کو اردو نثر کی وہی شان دار روایات ورثے میں ملیں جن کا تذکرہ پچھلے باب میں ہو چکا ہے۔ ان روایات میں توسیع و ترقی مولانا کا ایک ادبی کارنامہ ہے۔ بلاشبہ وہ عصر حاضر کے اہم ترین اور عظیم ترین مفکر اسلام ہیں اور ان کے علمی کمالات کا موازنہ آج کی دنیا کے بڑے سے بڑے مفکر کے ساتھ بہ آسانی اور بہ خوبی کیا جا سکتا ہے۔ مولانا کی فکر انقلابی اور ان کا نصب العین پورے معاشرے کی ایک بنیادی اور ہمہ گیر اصلاح ہے۔ وہ دور جدید میں اسلامی خطوط پر انسانیت کی نشاۃ ثانیہ کے نقیب ہیں۔ انھوں نے زندگی کے ہر شعبے میں کُلّی انقلاب کی دعوت دی ہے۔ ان کا نظریۂ حیات اور نظام زندگی فرد، سماج اور ریاست کی تمام سرگرمیوں پر محیط ہے۔ یہ وسیع ترین پیمانے پر انسان سازی کا مطمحِ نظر ہے۔ اس مقصد کے لیے مولانا مودودی ایک طرف مروجہ افکار و میلانات پر شدید ترین تنقید کرتے ہیں تو دوسری طرف بہتر رجحانات و خیالات کی اشاعت کا نقشہ بھی پیش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے اصلاحِ احوال کے لیے ایک منظّم عملی جدوجہد بھی کی، ایک زبردست تحریک چلائی، ایک مضبوط و فعال تنظیم قائم کی اور متعدد قائدانہ اقدامات کیے۔

یہ مہمات انجام دینے کے لیے مولانا مودودیؒ نے ایک عظیم الشان لٹریچر اپنے قلم سے تیار کیا اور متنوع موضوعات پر چھوٹی بڑی کثیر التعداد کتابیں تصنیف کیں، مضامین و رسائل لکھے

اور خطبات دیے۔ ان کی تصانیف کی تعداد ایک اندازے کے مطابق تقریباً اسّی بتائی جاتی ہے۔[1]
مولانا کی تمام تحریریں اردو میں ہیں، جن کے تراجم دنیا کی اکثر اہم زبانوں میں ہوئے ہیں۔ یہ تحریریں مجموعی طور پر ایک دائرۃ المعارف ترتیب دیتی ہیں اور اپنے مصنف کے قاموسی ذہن کی ترجمان ہیں۔ ان میں دینیات و اخلاقیات سے لے کر سیاسیات و معاشیات تک کے مسائل زیرِ بحث آئے ہیں۔ بیسویں صدی کے تیسرے عشرے سے لے کر نصف صدی تک مولانا نے مختلف مراحل و مواقع پر مسلسل اور بہ کثرت مضامین لکھے۔ ان مضامین میں مواد کے ساتھ ساتھ اسلوب بیان کا تنوع بھی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو ادب کے ہر قسم کے اسلوبِ اظہار پر پوری قدرت حاصل ہے اور ان کے طرز نگارش میں تناسب و توازن نمایاں ہے۔

اردو ادب کے لسانی سرچشموں میں کھڑی بولی کے مستند دہلوی محاورات، اردو، فارسی، عربی کے ادب عالی اور انگریزی زبان سے مولانا مودودیؒ کو پوری اور گہری واقفیت ہے، انھوں نے مشرقی و مغربی زبانوں میں علوم و فنون کا نہایت وسیع مطالعہ براہ راست کیا ہے، لہٰذا وہ ان زبانوں کے اسالیب بیان کے اداشناس ہیں۔ لیکن کثیر اللّسان اور وسیع المطالعہ (Polyglot and erudite) ہونے کے باوجود مولانا مودودیؒ منتشر الخیال نہیں ہیں۔ ان کا جامع ذہن بہت واضح، مرتب اور منظّم ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے متنوع مطالعات کے نتائج و تاثرات کو ایک مرکزِ فکر (Nucleus of thought) پر اپنے مخصوص معیار اقدار سے جانچ پرکھ کر ایک خاص سلیقے کے ساتھ مرتکز کرلیا ہے۔ یہ یک سوئی مولانا مودودیؒ کے اندازِ بیان میں سلاست و روانی کے علاوہ استواری و ہمواری پیدا کرتی ہے۔ اس لیے وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس کے تمام مضمرات کی تشریح پوری صفائی کے ساتھ کرتے ہیں۔ صراحت ان کے اسلوبِ اظہار کا نشانِ امتیاز ہے۔

---

(۱) ادبیات مودودی مرتبہ پروفیسر خورشید احمد، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، اشاعت ثانی ۱۹۸۵ صفحہ ۱۷

طرزِ مودودی کا ارتقاء

دورِ اوّل

اپنی تصنیفات وتالیفات کے ابتدائی دور میں مولانا مودودیؒ نے تراجم، سوانح، تواریخ اور صحافت کے ذیل میں جو کچھ لکھا ابھی اس کی مکمل ترتیب باقی ہے، خاص کر اخبارات کے مدیر کی حیثیت سے انھوں نے جو اداریے اور تبصرے لکھے ہیں ان کو مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن ان کی تحریروں کے دورِ اوّل (۱۹۲۰ تا ۱۹۳۰) میں ہی ان کی معرکہ آرا کتاب ''الجہاد فی الاسلام'' (۱۹۲۸) نے ان کے اسلوبِ بیان کا اوّلین نمونہ پیش کیا۔ اس کتاب کا باب اوّل ''اسلامی جہاد کی حقیقت'' ہے، جس میں بحث کا پہلا عنوان ''انسانی جان کا احترام'' ہے اور اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

> ''انسانی تمدن کی بنیاد جس قانون پر قائم ہے اس کی سب سے پہلی دفعہ یہ ہے کہ انسان کی جان اور اس کا خون محترم ہے۔ انسان کے تمدنی حقوق میں اوّلین حق زندہ رہنے کا حق ہے اور اس کے تمدنی فرائض میں اوّلین فرض زندہ رہنے دینے کا فرض ہے۔ دنیا کی جتنی شریعتیں اور مہذب قوانین ہیں ان سب میں احترام نفس کا یہ اخلاقی اصول ضرور موجود ہے۔ جس قانون اور مذہب میں اسے تسلیم نہ کیا گیا ہو وہ نہ تو مہذب انسانوں کا مذہب وقانون بن سکتا ہے، نہ اس کے ماتحت رہ کر کوئی انسانی جماعت پُرامن زندگی بسر کر سکتی ہے، نہ اسے کوئی فروغ حاصل ہو سکتا ہے۔ ہر شخص کی عقل خود سمجھ سکتی ہے کہ اگر انسان کی جان کی کوئی قیمت نہ ہو، اس کا کوئی احترام نہ ہو، اس کی

حفاظت کا کوئی بندوبست نہ ہو، تو چار آدمی کیسے مل کر رہ سکتے ہیں، ان میں کس طرح باہم کاروبار ہوسکتا ہے، انھیں وہ امن واطمینان اور وہ بے خوفی وجمیعتِ خاطر کیوں کر حاصل ہوسکتی ہے جس کی انسان کو تجارت، صنعت اور زراعت کرنے، دولت کمانے، گھر بنانے، سیروسفر کرنے اور متمدن زندگی بسر کرنے کے لیے ضرورت ہوتی ہے۔ پھر اگر ضروریات سے قطع نظر کر کے خالص انسانیت کی نظر سے دیکھا جائے تو اس لحاظ سے بھی کسی ذاتی فائدہ کی خاطر، یا کسی ذاتی عداوت کی خاطر اپنے ایک بھائی کو قتل کرنا بدترین قساوت اور انتہائی سنگ دلی ہے جس کا ارتکاب کر کے انسان میں کوئی اخلاقی بلندی پیدا ہونا تو درکنار، اس کا درجۂ انسانیت پر قائم رہنا بھی محال ہے۔''

(ص: ۱۲۳ اشاعت ۱۹۸۸)

کتاب کا خاتمہ حسبِ ذیل الفاظ پر ہوتا ہے:

یہاں یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ مغرب کے معاملہ میں تو تم مغربی قوموں کے عمل کو دیکھتے ہو مگر اسلام کے معاملہ میں مسلمانوں کے عمل کو نہیں دیکھتے بلکہ محض اسلامی قانون کو دیکھتے ہو۔ لیکن گزشتہ مباحث کو بغور دیکھنے سے یہ اعتراض خود بہ خود رفع ہوجاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی قانون اور مسلمانوں کا عمل دو بالکل الگ چیزیں ہیں۔ قانون سازی میں مسلمانوں کے عمل کو، بلکہ ان کی مرضی کو بھی کوئی دخل نہیں ہے۔ اس لیے جب قانون کے حسن وقبح پر بحث ہو تو عمل کا سوال قدرتی طور پر خارج از بحث ہونا چاہیے۔ برعکس اس کے مغربی قانون اور مغربی قوموں کا عمل دو مختلف چیزیں نہیں ہیں۔ قانون سازی میں ان قوموں کی مرضی کو ہی نہیں بلکہ ان کے عمل کو بھی خاص دخل حاصل ہے۔ اوپر یہ ثابت کیا جاچکا ہے کہ جہاں تک قانونِ جنگ کا تعلق ہے مغربی قوموں کا عمل آگے آگے چلتا ہے اور قانون کو اس کی پیروی کرنی پڑتی ہے۔ اس لیے ہم مغرب کے معاملہ میں ان کے عمل کو دیکھنے پر مجبور ہیں۔'' (ص: ۲۰۰)

دونوں اقتباسات میں پورا پیراگراف بلاکم وکاست، انہی رموز اوقاف کے ساتھ دے دیا گیا ہے جو اصل متن میں موجود ہیں۔ ہر ایک اقتباس میں الفاظ کی سادگی، بیان کی روانی، نکات کی برجستگی، بحث کی منطقیت، تجزیاتی انداز اور ترتیبِ اظہار نمایاں ہے۔ الفاظ کے استعمال میں ایک خاص بات یہ ہے کہ اگر کسی جگہ کوئی نسبتاً دقیق لفظ آ گیا ہے تو اس کا سہل تر مترادف بھی

ساتھ ہی دے دیا گیا ہے، مثلاً ”بدترین قساوت اور انتہائی سنگ دلی“ پہلے پیراگراف کے آخر میں۔ اس کے علاوہ جو مترادفات عمومی طور پر استعمال کیے گئے ہیں، مثلاً اسی پیراگراف کے وسط میں ”امن واطمینان“ اور ”بے خوفی وجمعیتِ خاطر“، وہ یا تو محاورۂ زبان کے قاعدے پر ہیں یا مفہوم میں کوئی لطیف اضافہ کرنے کے لیے۔ ہر حال میں مصنف کا مقصد فہم عام کے لیے خیال کو زیادہ سے زیادہ واضح کرنا ہے، یہاں تک کہ پیراگراف کے شروع ہی میں ”شریعتیں“ کے ساتھ ساتھ ”اور مہذب قوانین“ اس کے بعد ”قانون“ کے ساتھ ”اور مذہب“، پھر ”مذہب وقانون“ کا استعمال صرف دو نکات کی نشان دہی کے لیے نہیں، ایک نکتے، شریعتیں یا مذہب، کی تشریح اور عصری تعبیر کے لیے بھی ہے۔ یہ افہام و تفہیم کا وہ انداز ہے جو عالم و عامی دونوں کے ذہنوں سے خطاب کرنے کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔ اس کی خصوصیات تصریح و تفصیل ہے، تاکہ موضوعِ بحث بالکل واضح ہو جائے اور علماء وعوام اس سے یکساں مستفید ہو سکیں۔

الفاظ وتراکیب منتخب وموزوں ہیں، مگر عبارت میں کوئی تکلف نہیں، بے ساختگی ہے، اس لیے کہ مصنف کا مقصد عبارت آرائی نہیں، معنی آفرینی ہے، وہ بھی ایک سوچے سمجھے ہوئے موضوع کے ساتھ انصاف کرنے کے لیے۔ مصنف نے اس سلسلے میں سب سے پہلے مضمون کے پورے مواد پر قدرت حاصل کر کے اپنی علمی بحث کے تمام مقدمات مرتب اور نکات فراہم کر لیے ہیں۔ اس کے بعد اس نے اظہارِ خیال کے لیے قلم اٹھایا ہے، لہٰذا اس کے جملے ایک سلیقے اور سلاست کے ساتھ متعلقہ معانی ومضمرات کی تہیں کھولتے چلے جاتے ہیں۔ اس معاملہ میں صفائی بیان کا عالم یہ ہے کہ پورے پیراگراف میں صرف ایک دقیق فارسی ترکیب ”احترام نفس“ کا استعمال کیا گیا ہے، جو ممکن ہے کہ انگریزی لفظ (Self Respect) کی ترجمانی ہو، مگر عبارت اتنی چست ہے کہ ترجمے کا گمان کم از کم پہلی نظر میں نہیں ہوتا، پھر ترکیب بہت سُبک ہے اور نامانوس نہیں محسوس ہوتی۔

ان خصوصیات کے علاوہ پیراگراف کی قماش بندی، تنظیم خیال اور ربطِ کلام کی خوبیوں کا مطالعہ کرنے کے لیے دوسرے اقتباس پر ایک نظر ڈالنا کافی ہوگا۔ ”مغربی قوموں کے عمل“ کا جو نکتہ پہلی سطر کے پہلے جملے میں اٹھایا گیا ہے اسی پر آخری سطر کا آخری جملہ ختم ہوتا ہے، جب کہ بیچ کی سب سطریں اور تمام جملے ابتدا و انتہا کے درمیان ارتقاء کا کام کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے

کہ ہر جملے سے ایک جملہ نکلتا ہے اور دونوں باہم پیوستہ ہو کر تیسرے جملے کو سامنے لاتے ہیں اور پورا بیان اسی فطری رفتار سے آگے بڑھتا ہے۔ اجزا کے درمیان یہ ہم آہنگی جس مجموعے کی تشکیل کرتی ہے وہ مقدمات کا ایک لازمی نتیجہ بن کر رونما ہوتا ہے اور پڑھنے والے کے ذہن کو اپنی مضبوط گرفت میں لے لیتا ہے۔ یہ ایک ایسی منطق کا زور ہے جو اپنی رو میں شبہات و تاملات کو بہا لے جاتی ہے اور تیقن کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ پڑھنے والے کو محسوس ہوتا ہے جیسے اس کے ذہن کی کوئی گرہ کھل گئی ہو، کوئی گتھی سلجھ گئی ہو، کوئی مسئلہ حل ہو گیا ہو۔ یہ طرز بیان محض نکتہ سنجی نہیں ہے، انکشافِ حقیقت ہے اور اس سے ایک پُر مسرت بصیرت حاصل ہوتی ہے، دل کو اطمینان ہوتا ہے اور دماغ کو روشنی ملتی ہے، صداقت آشکار ہوتی ہے، آفاقی اقدارِ حیات پر ایمان محکم ہوتا ہے۔

الجہاد کے اسلوبِ نگارش پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں اردو نثر ترقی کر کے دقیق سے دقیق موضوعات و مضمرات کے صاف، صریح، معیّن اور مؤثر اظہار کے قابل ہو چکی تھی، یعنی پیش رو اساتذۂ ادب سے مولانا مودودی کو زبان و بیان کا جو ورثہ ملا تھا وہ کافی ترقی یافتہ تھا اور اردو نثر کی اعلیٰ روایات اتنی راسخ، وسیع اور مروج ہو چکی تھیں کہ ایک عالی دماغ مصنف کی ایک نہایت سنجیدہ موضوع پر پہلی کوشش بھی سلاست و نفاست اور فصاحت و بلاغت کا آئینہ ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر کہنا چاہیے کہ اردو کے نثری ادب کو شبلی و حالی اور ان کے ہم عصروں نے جہاں پر چھوڑا تھا مولانا مودودی نے وہیں سے اپنا علمی و ادبی سفر شروع کیا۔ یہ بہ یک وقت روایت اور اس میں ایک نئے تجربے دونوں کی وقعت و اہمیت کی دلیل ہے۔

دورِ دوم

طرزِ مودودی کے ارتقاء کا دوسرا دور ۱۹۳۰ تا ۱۹۵۰ دو دہائیوں پر مشتمل ہے۔ اسی زرخیز دور میں انھوں نے ترجمان القرآن جیسے علمی رسالے کے ذریعے وقت کے تمام اہم مسائل پر اظہارِ خیال کیا اور ان آفاقی سوالات کے جواب بھی دیے جو صدیوں سے ذہنوں کو پریشان کر رہے تھے۔ رسالے میں شائع شدہ مضامین کے متعدد مجموعے اور ان مضامین میں اٹھائے گئے مباحث پر مشتمل کتابیں بھی شائع ہو کر بہت مقبول ہوئیں۔ ان مجموعوں اور کتابوں کو اردو دنیا میں بہ کثرت پڑھا گیا اور ان کے متعدد اڈیشن نکل چکے ہیں۔ یہ مولانا کی وہ زبردست علمی و ادبی

کاوشیں ہیں جنھوں نے ان کی عبقریت، قاموسیت اور قدرتِ بیان کا سکہ عوام وخواص کے دلوں پر بٹھا دیا۔ پھر یہی وہ دور ہے جس میں مولانا مودودی نے عمل کے میدان میں اتر کر ''جماعت اسلامی'' جیسی نہایت منظم، فعّال اور ہمہ گیر تنظیم قائم کی اور تجدید واصلاح کی وہ تحریک چلائی جو قدیم تحریکِ مجاہدین اور جدید تحریکِ نشاۃِ ثانیہ دونوں کے تصورات واقدامات کا مجموعہ ہے۔ اس معاملے میں کہا جا سکتا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے منصوبۂ انقلاب کو عمل درآمد کے جس مرحلے پر چھوڑا تھا مولانا مودودی نے اپنی جدوجہد وہیں سے شروع کی۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے دینِ اسلام اور اس کی آخری شریعت کو پوری زندگی کے مکمل نظریہ ونظام کی حیثیت سے پیش کر کے فرد، معاشرے اور ریاست تینوں کی عمومی اور مجموعی تبدیلی وبہتری کا نقشہ مرتب کیا اور لائحۂ عمل ترتیب دیا۔

یہ بہت ہی پیچیدہ، مرکب، ہمہ جہت اور دشوار مہم تھی، جس کو نظریاتی سطح پر سر کرنے کے لیے ایک نہایت پختہ وبالیدہ ذہن کے ساتھ ساتھ طاقت ور، رنگا رنگ اور پُر اثر قلم کی ضرورت تھی۔ قدرت نے مولانا مودودی کو یہ قلم عطا کیا اور انھوں نے اس کا پورا فائدہ اٹھایا۔ اس قلم نے اپنے نصب العین کی راہ ہموار کرنے کے لیے تیر، تلوار اور تفنگ سب کا کام کیا۔ اس کی فتوحات سے طرز مودودی کے تنوع کا سراغ ملتا ہے۔ مولانا مودودی اپنے مخاطب اور موقع خطاب یا موضوع ومواد کے لحاظ سے اپنے اسلوب بیان میں لچک پیدا کرتے ہیں، وہ سلیس سے سلیس اور نفیس سے نفیس پیرایۂ اظہار اختیار کر سکتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کے انداز وادا کی ہمواری و استواری میں کوئی فرق نہیں آتا۔ وہ ہر سطح کے قارئین سے ان کے مبلغِ علم اور پیمانۂ شعور کے مطابق گفتگو کرتے ہوئے بھی زبان وادب کی بنیادی فصاحت اور انتہائی بلاغت کی تمام شرطوں کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ ان کے سلیقۂ تحریر کی شستگی اور شائستگی ہر حال میں برقرار رہتی ہے۔ یہ حقیقت جہاں مولانا مودودی کی ذہنی تربیت کے اعلیٰ معیار کی نشان دہی کرتی ہے وہیں ان کی حکمتِ تبلیغ کے شان دار نمونے کی بھی۔ اس سے اظہار وابلاغ میں تاثیر پیدا ہوتی ہے اور ترسیل کی کامیابی کا ثبوت ملتا ہے۔ اور یہ بڑی گہری اونچی ادبیت کا بھی نشان ہے۔

طرزِ مودودی کے ادبی کمالات کے دورِ دوم میں ایک طرف ''دینیات'' اور ''خطبات'' جیسی کتابیں ہیں جو اصلاً طلبہ اور عوام کے لیے تحریر کی گئیں، جب کہ دوسری طرف ''سود'' اور ''پردہ''

جیسی تصنیفات ہیں جن میں ماہرین اور قائدین کو بھی دعوتِ فکر دی گئی ہے۔ ان کتابوں کے سالیبِ بیان کی مثالیں پیش کرنے کے لیے ہر ایک سے ایک ایک اقتباس ذیل میں دیا جاتا ہے:

۱۔ ''تم دیکھتے ہو کہ دنیا میں جتنی چیزیں ہیں سب ایک قاعدے اور قانون کی تابع ہیں۔ چاند اور تارے سب ایک زبردست قاعدے میں بندھے ہوئے ہیں جس کے خلاف وہ بال برابر جنبش نہیں کر سکتے۔ زمین اپنی خاص رفتار کے ساتھ گھوم رہی ہے۔ اس کے لیے جو وقت اور رفتار اور راستہ مقرر کیا گیا ہے اس میں ذرا فرق نہیں آتا۔ پانی اور ہوا، روشنی اور حرارت، سب ایک ضابطے کے پابند ہیں۔ جمادات و نباتات اور حیوانات میں ہر ایک کے لیے جو قانون مقرر ہے اسی کے مطابق یہ سب پیدا ہوتے ہیں، بڑھتے ہیں اور گھٹتے ہیں، جیتے ہیں اور مرتے ہیں۔ خود انسان کی حالت پر تم غور کرو گے تو تم کو معلوم ہوگا کہ وہ بھی قانونِ قدرت کا تابع ہے، جو قاعدہ اس کی پیدائش کے لیے مقرر کیا گیا ہے اسی کے مطابق سانس لیتا ہے، پانی اور غذا اور حرارت اور روشنی حاصل کرتا ہے۔ اس کے دل کی حرکت، اس کے خون کی گردش، اس کے سانس کی آمد و رفت اسی ضابطے کی پابند ہے۔ اس کا دماغ، اس کا معدہ، اس کے پھیپھڑے، اس کے اعصاب اور عضلات، اس کے ہاتھ پاؤں، زبان، آنکھیں، کان اور ناک، غرض اس کے جسم کا ایک ایک حصہ وہی کام کر رہا ہے جو اس کے لیے مقرر ہے اور اسی طریقہ پر کام کر رہا ہے جو اس کو بتا دیا گیا ہے۔''

(دینیات، اشاعت ۱۹۸۷، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ص:۱۱)

۲۔ ''دنیا بھر کی قوموں سے نکلے ہوئے لوگوں کا ایک مرکز پر اجتماع، اور وہ بھی ایسی یک دلی و یک جہتی کے ساتھ، ایسی ہم خیالی و ہم آہنگی کے ساتھ، ایسے پاک جذبات، پاک مقاصد اور پاک اعمال کے ساتھ، حقیقت میں اتنی بڑی نعمت ہے جو آدم کی اولاد کو اسلام کے سوا کسی نے نہیں دی، دنیا کی قومیں ہمیشہ ایک دوسرے سے ملتی رہی ہیں، مگر کس طرح؟ میدانِ جنگ میں گلے کاٹنے کے لیے، یا صلح کانفرنسوں میں ملکوں کی تقسیم اور قوموں کے بٹوارے کے لیے، یا مجلسِ اقوام متحدہ میں، تا کہ ہر قوم دوسری قوم کے خلاف دھوکے، فریب، سازش اور بے ایمانیوں کے جال پھیلائے اور دوسروں کے نقصان سے اپنا فائدہ کرنے کی کوشش کرے۔ تمام قوموں

کے عام لوگوں کا صاف دلی کے ساتھ ملنا، نیک اخلاق اور پاک خیالات کے ساتھ ملنا، محبت اور خلوص کے ساتھ ملنا، قلبی و روحانی اتحاد کے ساتھ ملنا، خیالات، اعمال اور مقاصد کی یک جہتی کے ساتھ ملنا، اور صرف ایک ہی دفعہ مل کر نہ رہ جانا، بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہر سال ایک ایک مرکز پر اسی طرح اکٹھے ہوتے رہنا، کیا یہ نعمت اسلام کے سوا بنی نوعِ انسان کو اور بھی کہیں ملتی ہے؟ دنیا میں امن قائم کرنے، قوموں کی دشمنیوں کو مٹانے اور لڑائی جھگڑوں کے بہ جائے محبت، دوستی اور برادری کی فضا پیدا کرنے کے لیے اس سے بہتر نسخہ کس نے تجویز کیا ہے؟''

(خطبات، حصہ پنجم، حقیقت حج، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، اشاعت ۸۷ء، ص: ۴۵، ۴۶)

۲- ''یہ وہ بلائے عظیم ہے جس کی تباہ کاریاں دیکھ دیکھ کر خود مغربی ممالک کے صاحب فکر لوگ چیخ اُٹھے ہیں اور وہاں مختلف سمتوں سے یہ آواز بلند ہو رہی ہے کہ مالیات کی اتنی طاقت کا ایک چھوٹے سے غیر ذمہ دار، خود غرض طبقے کے ہاتھ میں مرتکز ہو جانا پوری اجتماعی زندگی کے لیے سخت مہلک ہے، مگر ہمارے ہاں ابھی یہ تقریریں ہوئے جارہی ہیں کہ سود خواری تو پرانے گدی نشین مہاجن کی حرام و نجس تھی، آج کا کرسی نشین و موٹر نشین بینکر بے چارہ تو بڑا ہی پاکیزہ کاروبار کر رہا ہے، اس کے کاروبار میں روپیہ دینا اور اس سے اپنا حصہ لے لینا آخر کیوں حرام ہے؟ حالانکہ اگر فی الحقیقت پرانے مہاجنوں اور آج کے بینکروں میں کوئی فرق واقع ہوا ہے تو وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ پہلے یہ لوگ اکیلے ڈاکہ مارتے تھے، اب انھوں نے جتھ بندی کر کے ڈاکوؤں کے بڑے بڑے گروہ بنا لیے ہیں، اور دوسرا فرق، جو شاید پہلے سے بھی بڑا ہے، یہ ہے کہ پہلے ان میں کا ہر ڈاکو نقب زنی کے آلات اور مردم کشی کے ہتھیار سب کچھ اپنے ہی پاس سے لاتا تھا، مگر اب سارے ملک کی آبادی اپنی حماقت اور قانون کی غفلت و جہالت کی وجہ سے بے شمار آلات اور اسلحہ فراہم کر کے ''کرائے'' پر ان منظم ڈاکوؤں کے حوالے کر دیتی ہے۔ روشنی میں یہ اس کو کرایہ ادا کرتے ہیں اور اندھیرے میں اسی آبادی پر اسی کے فراہم کیے ہوئے آلات و اسلحہ سے ڈاکہ ڈالتے ہیں۔''

(''سود'' مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، اشاعت ۸۶ء، ص: ۹۵-۹۶)

۴- ''جو شخص اسلامی قانون کے مقاصد کو سمجھتا ہے اور اس کے ساتھ کچھ عقل عام (Common Sense) بھی رکھتا ہے اس کے لیے یہ سمجھنا کچھ بھی مشکل نہیں کہ عورتوں کو کھلے چہروں کے ساتھ باہر پھرنے کی عام اجازت دینا ان مقاصد کے بالکل خلاف ہے جن کو اسلام اس قدر اہمیت دے رہا ہے۔ ایک انسان کو دوسرے انسان کی

جو چیز سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ اس کا چہرہ ہی تو ہے۔ انسان کی خلقی و پیدائشی زینت، یا دوسرے الفاظ میں انسانی حسن کا سب سے بڑا مظہر چہرہ ہے۔ نگاہوں کو سب سے زیادہ وہی کھینچتا ہے۔ جذبات کو سب سے زیادہ وہی اپیل کرتا ہے۔ صنفی جذب وانجذاب کا سب سے زیادہ قوی ایجنٹ وہی ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے نفسیات کے کسی گہرے علم کی بھی ضرورت نہیں۔ خود اپنے دل کو ٹٹولیے۔ اپنی آنکھوں سے فتویٰ طلب کیجیے۔ اپنے نفسی تجربات کا جائزہ لے کر دیکھیے۔ منافقت کی بات تو دوسری ہے۔ منافق اگر آفتاب کے وجود کو بھی اپنے مقصد کے خلاف دیکھے گا تو دن دھاڑے کہہ دے گا کہ آفتاب موجود نہیں۔ البتہ صداقت سے کام لیجیے گا تو آپ کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ صنفی تحریک (Sex Appeal) میں جسم کی ساری زینتوں سے زیادہ حصہ اس فطری زینت کا ہے جو اللہ نے چہرے کی ساخت میں رکھی ہے۔ اگر آپ کو کسی لڑکی سے شادی کرنی ہو اور آپ اسے دیکھ کر آخری فیصلہ کرنا چاہتے ہوں تو سچ بتائیے کہ کیا دیکھ کر آپ فیصلہ کریں گے؟ ایک شکل اس کے دیکھنے کی یہ ہوسکتی ہے کہ چہرہ کے سوا وہ پوری کی پوری آپ کے سامنے ہو۔ دوسری یہ ہوسکتی ہے کہ ایک جھروکے میں سے وہ صرف اپنا چہرہ دکھادے۔ بتائیے کہ دونوں شکلوں میں کون سی شکل کو آپ ترجیح دیں گے؟ سچ بتائیے کیا سارے جسم کی بہ نسبت چہرہ کا حسن آپ کی نگاہ میں اہم ترین نہیں ہے؟''

(''پردہ''، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی اشاعت ۷۸ء، ص: ۲۴۵، ۲۴۶)

اقتباسات نمبر ایک اور دو کا انداز یکساں ہے۔ دونوں میں بہت آسان لفظوں میں بالکل سامنے کی باتوں سے کسی خاص نکتے کی وضاحت کی گئی ہے اور معروف حقائق یا مشہور واقعات کی مثالیں دے کر کوئی خیال دماغ میں اتارنے کی کوشش اس طرح کی گئی ہے کہ وہ دل کو بھی چھولے۔ طرز بیان ایک سہل تقریر کا ہے۔ نمبر ایک میں قاعدے اور قانون کی ہمہ گیری ثابت کرنے کے لیے مناظر فطرت سے اعضائے جسم تک کے حوالے دیے گئے ہیں اور ایک ایک چیز کا الگ الگ شمار کیا گیا ہے۔ یہ تشریح بڑی روانی سے کی گئی ہے۔ نمبر دو میں ''ایک مرکز پر اجتماع'' کی ان برکتوں کی تفصیل ہے جن کا تعلق حج سے ہے۔ اس سلسلے میں اسلامی اجتماع کو دوسرے اجتماعات سے ممتاز، بہتر اور برتر ثابت کرنے کے لیے جنگ سے امن تک کے غیر اسلامی اجتماعات کی خرابیوں اور تباہیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس تقابلی مطالعہ کے بعد اجتماعِ اسلامی کی مثبت خوبیوں کو نمایاں کیا گیا ہے اور وہ خصوصیات بتائی گئی ہیں جو حج کی اسلامی نعمت کے سوا کسی

اور دنیوی اجتماع میں نہیں پائی جاتیں۔ یہ ایک تجزیہ ہے جس کی منطق ایک عام آدمی کی بھی سمجھ میں آسکتی ہے۔ان دونوں اقتباسات میں سے کسی میں بھی کوئی بھی سخت لفظ استعمال نہیں کیا گیا ہے، نہ کوئی مشکل جملہ استعمال کیا گیا ہے، نہ کوئی دقیق دلیل دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ فارسی تراکیب کا استعمال کم سے کم کیا گیا ہے اور جو ہے وہ بھی بہت مانوس و معروف، جیسے نمبر ایک میں ''قانونِ قدرت'' اور نمبر دو میں ''میدانِ جنگ'' یا بنی نوع انسان۔''

اقتباسات نمبر تین اور چار میں سلاست کے باوجود شیوۂ بیان کی چاشنی میں اضافہ ہوا ہے، جس سے طرزِ اظہار کا تیکھا پن بڑھ گیا ہے، اس نشتر کی نوک زیادہ تیز ہوگئی ہے جو مولانا فاسد مادّوں پر لگانا چاہتے ہیں اور وہ استدلال زیادہ پُر اثر ہوگیا ہے جو مولانا اپنے نقطۂ نظر کے حق میں پیش کرتے ہیں، ان کی بحث پہلے سے زیادہ دماغوں کو تسخیر کرنے لگتی ہے، گرچہ دلوں کے تار بھی پہلے ہی کی طرح چھیڑتی ہے، مختصر یہ کہ اسلوبِ تحریر ہر جہت سے زیادہ بالیدہ اور تراشیدہ، زوردار اور طرح دار ہو جاتا ہے۔

طرزِ مودودی کی اس بڑھتی ہوئی ثروت و نفاست اور دبازت و لطافت میں ایک نمایاں عنصر مزاح اور ظرافت کا ہے، جس کے طنزیہ اشارے اقتباس نمبر ۳ میں بہت دل چسپ اور کارگر ہیں، مثلاً ''گدّی نشیں مہاجن'' کے مقابلے میں ''کرسی نشیں و موٹر نشیں بینکر'' پھر سودی بنک کاری کے مروجہ طریقوں کی ''نقب زنی کے آلات'' سے تمثیل۔ یقیناً بینک کاری کے سلسلے میں ساہوکاروں کی جتھ بندی اور اپنے شکاروں کے ہی فراہم کیے ہوئے اسلحوں سے ان پر ڈاکہ زنی کی جو تصویر زیر بحث اقتباس میں پیش کی گئی ہے اس کے نقوش ہول ناک اور تاثرات تلخ ہیں، لیکن صورتِ حال کی مضحکہ خیزی سود خواری کے جدید ترین ترقی یافتہ انداز و اطوار کی قلعی کھولنے میں بہت موثر ثابت ہوتی ہے، اور یہی مصنف کا مقصد ہے جس میں وہ پوری طرح کامیاب ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ سود عصر حاضر کے تمدن میں خون بن کر دوڑ رہا ہے اور اس کی ہلاکت انگیزی اتنی بڑھ گئی ہے کہ اس کی خرابیوں سے خبردار کرنے کے لیے اس پر تنقید میں شدت کی ضرورت ہے۔ مصنف کی ادبی حکمت نے تمسخر سے اسی شدت کا کام لیا ہے، جس کے سبب سود خواری کا فتنہ و فساد اپنی مکروہ ترین شکل میں بے نقاب ہو جاتا ہے۔

مولانا مودودی کا اسلوب بیان نہایت جید و جدید ہے۔ اس کی جدت و جودت کا ایک

نمونہ ان کی تحریر میں حسب موقع جا بہ جا انگریزی الفاظ کا استعمال ہے، مثال کے طور پر اقتباس نمبر ۴ میں Common Sense اور Sex Appeal۔ لیکن مولانا اس استعمال کو اردو عبارت کا جز بنانے کے لیے انگریزی الفاظ کا برجستہ ترجمہ ساتھ ساتھ دے دیتے ہیں، وہ بھی اس طرح کہ متن میں اصلی الفاظ اردو ہی ہیں اور انگریزی الفاظ گویا مترادفات بن جاتے ہیں۔ چنانچہ اردو عبارت کی روانی اور شستگی میں انگریزی الفاظ کے داخل ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، کوئی خلل نہیں واقع ہوتا، اس کی فصاحت برقرار رہتی ہے اور بلاغت میں قدرے اضافہ ہوتا ہے۔ زیر بحث اقتباس میں نمبر ۳ کی طرح ایک موزوں مثال سے موضوع کی تصریح کا کام بہت خوب صورتی کے ساتھ لیا گیا ہے۔ چہرے کی اہمیت جسم انسانی میں واضح کرنے کے لیے بیوی کے انتخاب کی جو تصویر پیش کی گئی ہے وہ پردے کے مخالف کو لاجواب کرنے والی ہے۔ اس سلسلے میں مصنف نے پہلے ایک منطقی و تجزیاتی استدلال کیا، پھر استدلال کے حق میں ایک تمثیل سامنے رکھی۔ دلیل اور مثال کی اس ترتیب و ترکیب نے مصنف کے اٹھائے ہوئے نکتے کو قطعی طور پر ثابت کر دیا۔

دورِ دوم میں مولانا مودودی کی تحریروں پر ایک مجموعی نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اسلوب میں بہ تدریج چاشنی اور تیز ابیت کا اضافہ ہوتا ہے، جب کہ روانی و برجستگی اس میں شروع سے ہویدا ہے۔ یہ اضافہ طرزِ نگارش میں ایک دل کشی پیدا کرتا ہے اور اس سے بیان کی تاثیر بڑھتی ہے، اظہار کی سلاست میں ابلاغ کی رعنائی کا عنصر ابھرتا ہے اور لسانی شستگی میں ادبی پختگی کے آثار نمایاں ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ انداز تحریر کے اس ارتقاء سے رنگارنگی اور لچک داری کے وہ نقوش نمودار ہوتے ہیں، جو نثر کو زیادہ سے زیادہ شائستہ اور کارآمد بناتے ہیں۔ اس ترقی میں تمثیل کی گہری ادبیت منطقی تجزیے کو موثر اور ساتھ ہی خوش گوار بنا دیتی ہے۔ پھر افعال کے بہ کثرت استعمال سے عبارت میں حرکیت رونما ہوتی ہے اور الفاظ و تراکیب کی موزونی کے ساتھ محاورات کی چستی، اسلوب کی طاقت، طلاقت اور جزالت کا باعث ہوتی ہے۔ ایسے طرزِ بیان میں صباحت بھی ہے، ملاحت بھی، شوکت بھی اور صلابت بھی۔

دورسوم

مولانا مودودی کے اسلوبِ بیان کا تیسرا اور آخری دور ۱۹۵۰ سے ۱۹۷۹ تک تیس سال پر مشتمل ہے۔اس دور میں ایک صاحبِ طرز مصنف کی حیثیت سے ان کی شہرت نقطۂ عروج پر پہنچ جاتی ہے اور ان کے انداز پر سوچنے اور لکھنے والوں کا ایک مکتبِ فکر اور مکتب ادب پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ دور قبل کے دور سے مختلف نہیں ہے بلکہ اسے اس کا تسلسل کہا جاسکتا ہے۔اس سے پہلے کے دو دور میں مولانا مودودی کے زبان و بیان کی جو خصوصیات ہم دیکھ چکے ہیں وہ آخری دور میں بھی قائم رہتی ہیں اور سلاست و نفاست کا جو امتزاج شروع سے مولانا کے طرزِ تحریر میں نظر آتا ہے وہ مزید محکم ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ ادبیت کے دونوں عناصر میں کوئی تمیز باقی نہیں رہتی۔

طرزِ مودودی کی فصاحت و بلاغت کے بہ کثرت نمونے اس کے آخری دور میں پائے جاتے ہیں، جن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مودودی کے قلم کی توانائی میں عمر گزرنے سے کوئی فرق نہیں واقع ہوتا اور قدرتِ بیان کے جو مظاہر پہلے رونما ہو چکے تھے وہ بعد میں بھی برقرار رہے۔مولانا کے اسلوب کی شگفتگی برابر تازہ رہی اور اس کی تہہ داری ہر حال میں معانی کے پیچ و خم واضح کرتی رہی۔نثر مودودی کی اس لطیف دبازت یا دبیز لطافت کے مشاہدے کے لیے تیسرے دور کی مقبول ترین تصنیف ''خلافت و ملوکیت'' سے چند مثالیں کافی ہوں گی:

۱- ''اس جائز اور صحیح نوعیت کی خلافت کا حامل کوئی ایک شخص یا خاندان یا طبقہ نہیں ہوتا، بلکہ وہ جماعت (Community) اپنی مجموعی حیثیت میں ہوتی ہے جس نے مذکورِ بالا اصولوں کو تسلیم کر کے اپنی ریاست قائم کی ہو۔سورۂ نور کی آیت ۵۵ کے الفاظ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ اس معاملہ میں صریح ہیں۔اس فقرے کی رو سے اہلِ ایمان کی جماعت کا ہر فرد خلافت میں برابر کا حصہ دار ہے۔کسی شخص یا طبقہ کو عام مومنین کے اختیاراتِ خلافت سلب کر کے انھیں اپنے اندر مرکوز کر لینے کا حق نہیں ہے۔نہ کوئی شخص یا طبقہ اپنے حق میں خدا کی خصوصی خلافت کا دعویٰ کر سکتا ہے۔یہی چیز اسلامی خلافت کو ملوکیت، طبقاتی حکومت اور مذہبی پیشواؤں کی حکومت سے الگ کر کے اسے جمہوریت کے رخ پر موڑتی ہے۔لیکن اس میں اور مغربی تصورِ جمہوریت میں اصولی فرق یہ ہے کہ مغربی تصور کی جمہوریت عوامی حاکمیت (Popular

Sovereignty) کے اصول پر قائم ہوتی ہے، اور اس کے برعکس اسلام کی جمہوری خلافت میں خود عوام خدا کی حاکمیت تسلیم کرکے اپنے اختیارات کو برضا و رغبت قانون خداوندی کے حدود میں محدود کرلیتے ہیں۔"
(مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، اشاعت ۱۹۸۸، ص: ۳۳، ۳۴)

۲۔ "لیکن یہ ظاہر ہے کہ اسلام کا منشا قیادت کی اس تقسیم سے پورا نہیں ہوتا۔ سیاسی قیادت سے الگ ہوکر دینی قیادت نے اسلامی اقدار کے تحفظ کے لیے جو بیش بہا خدمات انجام دیں وہ بلاشبہہ نہایت قابلِ قدر ہیں۔ آج یہ انہی خدمات کا نتیجہ ہے کہ دنیا میں اسلام زندہ ہے اور امت مسلمہ اپنے دین کو اس کے صحیح خدوخال میں دیکھ رہی ہے۔ مگر اسلام کا ٹھیک ٹھیک منشا تو اسی صورت میں پورا ہوسکتا ہے جب کہ اس امت کو ایک ایسی قیادت میسر ہو جو خلافت راشدہ کی طرح بہ یک وقت دینی قیادت بھی ہو اور سیاسی قیادت بھی، جس کا سیاسی اقتدار اپنے تمام ذرائع و وسائل نہ صرف دین کے مقاصد کی تکمیل میں صرف کرے، بلکہ اس کے اقتدار کا اصل مقصد دین ہی کے مقاصد کی تکمیل ہو۔ یہ صورت حال اگر ڈیڑھ دو صدی بھی باقی رہ گئی ہوتی تو شاید دنیا میں کفر باقی نہیں رہتا۔ یا اگر رہ بھی جاتا تو کبھی سر اٹھانے کے قابل نہ ہوتا۔"

۳۔ "ان متحارب اور متشدد گروہوں کے درمیان مسلمانوں کا سوادِ اعظم اپنے خیالات میں انہی نظریات اور اصولوں پر قائم تھا جو خلفاء راشدین کے زمانے سے مسلم چلے آرہے تھے اور جنھیں جمہور صحابہ و تابعین اور عامۃ المسلمین ابتدا سے اسلامی اصول و نظریات سمجھتے تھے۔ مسلمانوں کی بہ مشکل ۸ یا ۱۰ فیصدی آبادی اس تفرقے سے متاثر ہوئی تھی۔ باقی سب لوگ مسلک جمہوری پر قائم تھے۔ مگر دورِ اختلاف شروع ہونے کے بعد سے امام ابوحنیفہؒ کے وقت تک کسی نے ان اختلافی مسائل میں جمہور اہلِ اسلام کے مسلک کی باقاعدہ توضیح نہیں کی تھی جو ایک پورے نظامِ فکر کی شکل میں مرتب ہوتی، بلکہ مختلف فقہا و محدثین مختلف مواقع پر اپنے اقوال، فتاویٰ، روایات، یا طرزِ عمل سے منتشر طور پر اس کے کسی پہلو کو واضح کرتے رہتے تھے۔" (ص: ۲۰۵)

ان اقتباسات سے مترشح ہوتا ہے کہ مولانا مودودی کے اسلوب کا کلاسکی پہلو زیادہ نمایاں ہونے لگا ہے اور وہ اپنے مفہوم کی تعیین کے لیے فارسی و عربی الفاظ و تراکیب زیادہ استعمال

کرنے لگے ہیں جو اصل زبان کے مسلمہ محاورات ہیں اور علمی لحاظ سے زیادہ پر معنی یا ادبی اعتبار سے زیادہ خیال انگیز، مثلاً اقتباس نمبر ایک میں مسلمانوں کے بہ جائے ''مومنین'' اور نمبر تین میں ''عامۃ المسلمین'' یا ''متحارب'' اور ''متشدد'' جیسے نیم اصطلاحی الفاظ جمع کے معاملے میں بھی اصل عربی قاعدے پر ''فقہا و محدثین'' کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ ''مسلک جمہور'' اور ''جمہور اہل اسلام'' کی ترکیبیں فارسی قاعدے پر لائی گئی ہیں۔ نمبر ایک میں ''اختیاراتِ خلافت'' کی فارسی ترکیب کے علاوہ ''سلب'' کا ٹکسالی لفظ بھی ہے۔ اسی نمبر میں ''بہ رضا و رغبت'' کے علاوہ نمبر ۳ میں ''سوادِ اعظم'' بھی ٹکسالی الفاظ ہیں۔ نمبر ایک میں ''خلافت'' اور ''ملوکیت'' جیسی عربی سیاسی اصطلاحیں بھی جوں کی توں استعمال کی گئی ہیں۔ نمبر ۳ میں ''دورِ اختلاف'' کی فارسی ترکیب کے ساتھ عربی لفظ ''توضیح'' بھی ہے۔ اقتباس نمبر دو میں ''دینی قیادت''، ''سیاسی قیادت'' اور ''اسلامی اقدار'' یا ''امت مسلمہ'' اور ''خلافتِ راشدہ'' کے الفاظ بھی سکہ بند ہیں، اگر چہ بہت زیادہ مروج بھی۔

بہ ہر حال، اسلوبِ بیان کی اس ثقاہت میں ثقالت نہیں ہے، الفاظ واضح اور تراکیب سبک ہیں، جملے سلیس ہیں اور عبارت صریح و صاف۔ تنقید کی زبان میں کہنا چاہیے کہ زیرِ بحث متن دقیق نہیں، نفیس ہے، اس کی نکتہ سنجی جملہ بازی کی حد تک نہیں پہنچتی، اس میں کوئی اشکال نہیں، دبازت ہے، یہ وہ بالیدگی ہے جو عام معنی میں پیچیدگی یا ژولیدگی سے خالی ہے، اس کی تہہ داری میں کوئی راز داری نہیں، یہ استناد ہے، ابہام نہیں، یہ درحقیقت سادگی و پرکاری کا وہ مرکب ہے جسے ایک لفظ میں عمدگی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ اندازِ تحریر طرز مودودی کی متانت و ثروت پر تاکیدی نشان لگاتا ہے اور اس کی کلاسکیت پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مودودی کی نثر اردو کے ادبِ عالی کے بلند ترین معیار پر پوری اترتی ہے اور اس کا ایک بہترین نمونہ پیش کرتی ہے۔

تفہیم القرآن

اردو ادب کے لیے مولانا مودودی کی نثر کے تیسرے دور کا سب سے بڑا تحفہ قرآن مجید کی وہ ترجمانی ہے جو مولانا نے ترجمہ و تفسیر کی شکل میں کی اور وہ ''تفہیم القرآن'' کے نام سے

متعدد جلدوں میں سال ہا سال شائع ہوتی رہی۔ یہ نہ صرف مولانا کے طرز تحریر کا شاہکار ہے بلکہ اردو نثر کا بھی نقطۂ عروج۔ اس کی فصاحت و بلاغت، سلاست و نفاست، لطافت و دبازت اور پختگی و شگفتگی اردو کے نثری ادب میں بے نظیر ہے۔ تفسیر کے دیباچے میں مولانا رقم طراز ہیں:

''پہلی چیز جو ایک لفظی ترجمے کو پڑھتے وقت محسوس ہوتی ہے وہ روانیِ عبارت، زور بیان، بلاغتِ زبان اور تاثیر کلام کا فقدان ہے۔ قرآن کی سطروں کے نیچے آدمی کو ایک ایسی بے جان عبارت ملتی ہے جسے پڑھ کر نہ اس کی روح وجد میں آتی ہے، نہ اس کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، نہ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے ہیں، نہ اس کے جذبات میں کوئی طوفان برپا ہوتا ہے، نہ اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی چیز عقل وفکر کو تسخیر کرتی ہوئی قلب وجگر تک اترتی چلی جارہی ہے۔ اس طرح کا کوئی تاثر رونما ہونا تو درکنار، ترجمے کو پڑھتے وقت تو بسا اوقات آدمی یہ سوچتا رہ جاتا ہے کہ کیا واقعی یہی وہ کتاب ہے جس کی نظیر لانے کے لیے دنیا بھر کو چیلنج دیا گیا تھا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ لفظی ترجمے کی چھلنی صرف دوا کے خشک اجزا ہی کو اپنے اندر سے گزرنے دیتی ہے۔ رہی ادب کی وہ تیز وتند اسپرٹ جو قرآن کی اصل عبارت میں بھری ہوئی ہے، اس کا کوئی حصہ ترجمے میں شامل نہیں ہونے پاتا۔ وہ اس چھلنی کے اوپر ہی سے اڑ جاتی ہے۔ حالانکہ قرآن کی تاثیر میں اس کی پاکیزہ تعلیم اور اس کے عالی قدر مضامین کا جتنا حصہ ہے، اس کے ادب کا حصہ بھی اس سے کچھ کم نہیں ہے۔ یہی تو وہ چیز ہے جو سنگ دل سے سنگ دل آدمی کا دل بھی پگھلا دیتی تھی، جس نے بجلی کے کڑکے کی طرح عرب کی ساری زمین ہلا دی تھی، جس کی قوتِ تاثیر کا لوہا اس کے شدید ترین مخالفین تک مانتے تھے اور ڈرتے تھے کہ یہ جادو اثر کلام جو سنے گا وہ بالآخر نقد دل ہار بیٹھے گا۔ یہ چیز اگر قرآن میں نہ ہوتی اور وہ اسی طرح کی زبان میں نازل ہوا ہوتا جیسی اس کے ترجموں میں ہم کو ملتی ہے تو اہل عرب کے دلوں کو گرمانے اور نرمانے میں اسے ہرگز وہ کامیابی نہ حاصل ہوسکتی جو فی الواقع اسے حاصل ہوئی۔''

(جلد اوّل، اشاعت ۸۸ء مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ص: ۷)

قرآن مجید کے اردو تراجم کی صورتِ حال کے اس تجزیے کے بعد مولانا مودودی اپنا منصوبۂ عمل پیش کرتے ہیں:

''لفظی ترجمے کے طریقے میں کسر اور خامی کے یہی وہ پہلو ہیں جن کی تلافی کرنے کے لیے میں نے ''ترجمانی'' کا ڈھنگ اختیار کیا ہے۔ میں نے اس میں قرآن کے الفاظ کو اردو کا جامہ پہنانے کے بہ جائے یہ کوشش کی ہے کہ قرآن کی ایک عبارت کو پڑھ کر جو مفہوم میری سمجھ میں آتا ہے اور جو اثر میرے دل پر پڑتا ہے اسے حتیٰ الامکان صحت کے ساتھ اپنی زبان میں منتقل کر دوں، اسلوب بیان میں ترجمہ پن نہ ہو، عربی مبین کی ترجمانی اردوئے مبین میں ہو، تقریر کا ربط فطری طریقے سے تحریر کی زبان میں ظاہر ہو، اور کلام الٰہی کا مطلب و مدعا صاف صاف واضح ہونے کے ساتھ اس کا شاہانہ وقار اور زورِ بیان بھی جہاں تک بس چلے ترجمانی میں منعکس ہو جائے۔ اس طرح کے آزاد ترجمے کے لیے یہ تو بہر حال ناگزیر تھا کہ لفظی پابندیوں سے نکل کر ادائے مطالب کی جسارت کی جائے، لیکن معاملہ کلام الٰہی کا تھا، اس لیے میں نے بہت ڈرتے ڈرتے ہی یہ آزادی برتی ہے۔ جس حد تک احتیاط میرے امکان میں تھی، اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے میں نے اس امر کا پورا اہتمام کیا ہے کہ قرآن کی اپنی عبارت جتنی آزادیِ بیان کی گنجائش دیتی ہے اس سے تجاوز نہ ہونے پائے۔'' (ص: ۱۰-۱۱)

دیباچۂ تفہیم کا پہلا اقتباس ادب کی جس ''تیز و تند اسپرٹ'' کا ذکر قرآن مجید کی عبارت کے بارے میں کرتا ہے وہ خود دیباچے کی محولہ اردو عبارت میں عیاں ہے۔ زیرِ بحث اقتباس میں ''روانیِ عبارت، زورِ بیان، بلاغتِ زبان'' نمایاں ہے۔ اسی طرح دیباچے کے دوسرے اقتباس میں ''شاہانہ وقار'' کی طرف جو اشارہ کیا گیا ہے وہ بھی اس طرزِ تحریر میں موجود ہے جس کا اظہار مولانا مودودی نے اپنی دوسری علمی و ادبی فتوحات سے کچھ بڑھ کر ہی تفسیر قرآن میں کیا ہے۔ وہ اپنے الفاظ میں قرآن کی عربیِ مبین کی ترجمانی 'اردوے مبین'' میں کرنی چاہتے تھے اور انھوں نے کر کے دکھایا ہے۔ اقتباس نمبر ایک میں ہم دیکھتے ہیں کہ طرز مودودی کی فصاحت و بلاغت کا ایک عنصر معروف و مسلم اساتذۂ فن کے زبان زد اشعار کے فکر انگیز اشارات کا پُر اثر استعمال بھی ہے، جیسے مسدس حالی کے اس مشہور شعر کی نثری ترکیب:

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی

یہ گویا زبان کا استعاراتی استعمال ہے، مگر شعر کی تقطیع کے انداز میں نہیں بلکہ شعری پیکر

کو نثر میں اچھی طرح تحلیل کر کے اسے محاورے یا مثل کی طرح سلیس بنا دیا گیا ہے اور عبارت سے نثر میں شاعری کے بہ جائے صرف ایک اچھی طرح لکھی ہوئی، کڑھی اور سجی ہوئی تخلیقی نثر کا نمونہ سامنے آتا ہے۔ مولانا مودودی کے اسلوبِ بیان میں تشبیہ واستعارہ یا اشعار سے جا بہ جا اسی لطافت ونفاست کے ساتھ کام لیا گیا ہے۔ اس شانِ کلام سے نثر کی سلاست میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑتی، اس کی سبک رفتاری پر کوئی بوجھ نہیں پڑتا، صرف اس کی ثروت میں اضافہ ہوتا ہے اور اس کی دبازت بہت بڑھ جاتی ہے۔

تفہیم القرآن کا ادبی رنگ وآہنگ دو طریقوں سے رونما ہوا ہے، ایک عربی آیات کا اردو ترجمہ، دوسرے کلام الٰہی کے مفہوم کی انسانی تشریح۔ ان دونوں صورتوں میں مولانا مودودی کے قلم کی گل کاری اپنے عروج پر ہے۔ ترجمے کی مثالیں حسب ذیل ہیں:

۱۔ ''کیا وہ شخص جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندگی بخشی اور اس کو وہ روشنی عطا کی جس کے اجالے میں وہ لوگوں کے درمیان زندگی کی راہ طے کرتا ہے اس شخص کی طرح ہوسکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہوا ہو اور کسی طرح ان سے نہ نکلتا ہو؟ کافروں کے لیے تو اسی طرح ان کے اعمال خوش نما بنا دیے گئے ہیں، اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں اس کے بڑے بڑے مجرموں کو لگا دیا ہے کہ وہاں اپنے مکروفریب کا جال پھیلائیں۔ دراصل وہ اپنے فریب کے جال میں آپ پھنستے ہیں، مگر انہیں اس کا شعور نہیں ہے۔''
(الانعام: ۱۲۲-۲۳، تفہیم القرآن جلد اوّل مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، اشاعت ۸۸ء، ص: ۵۷۸-۷۹)

۲۔ ''حقیقت یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین میں بے شمار نشانیاں ہیں ایمان لانے والوں کے لیے۔ اور تمہاری اپنی پیدائش میں، اور ان حیوانات میں جن کو اللہ (زمین میں) پھیلا رہا ہے بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو یقین لانے والے ہیں۔ اور شب وروز کے فرق واختلاف میں، اور اس رزق میں جسے اللہ آسمان سے نازل فرماتا ہے۔ پھر اس کے ذریعہ سے مردہ زمین کو جلا اٹھاتا ہے، اور ہواؤں کی گردش میں بہت نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ یہ اللہ کی نشانیاں ہیں جنھیں ہم تمھارے سامنے ٹھیک بیان کر رہے ہیں۔ اب آخر اللہ اور اس کی آیات کے بعد اور کون سی بات ہے جس پر یہ لوگ ایمان لائیں گے؟''
(الجاثیہ: ۳-۶، تفہیم القرآن جلد چہارم، اشاعت ۶۸ء، ص: ۵۷۹-۸۱)

ان ترجموں میں ایک ایسی با محاورہ زبان استعمال کی گئی ہے، جس میں اردو کے سبھی لسانی وسائل وعناصر سے سلاست اور سلیقے کے ساتھ کام لیا گیا ہے، عربی وفارسی الفاظ کے پہلو بہ پہلو کھڑی بولی کے افعال بھی روانی بیان میں اضافہ کررہے ہیں، تراکیب کم سے کم ہیں، بلکہ محولہ بالا اقتباسات میں ہی نہیں، اور مترادفات عام فہم ہیں۔ یہ عبارت میں سادگی کی انتہا ہے، اس کے باوجود سنجیدگی میں کوئی فرق نہیں آتا، مفہوم کی گہرائی، وسعت اور بلندی بھی پوری طرح موجود ہے۔ ہر چیز صاف صاف ہے، ہر نکتہ واضح، ہر اشارہ صریح۔ یہ ایک ایسا طرزِ اظہار ہے جو صاف وصریح ہونے کے ساتھ ساتھ پُر تاثیر اور معنی خیز بھی ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات خاص کر قابلِ ذکر اور اہم ہے کہ مضمرات کی تشریح کے لیے قوسین کا استعمال صرف ایک جگہ کیا گیا ہے، وہ بھی بالکل مختصر، فقط دو الفاظ پر مشتمل۔ دوسری ضروری بات یہ کہ عربی لفظوں کی ثروت کم سے کم اردو لفظوں میں منتقل کی گئی ہے۔

ایسا جامع، واضح، مستند، سلیس، جان دار اور زوردار ترجمۂ قرآن، جس میں ساری توجہ صرف ادائے مفہوم پر مرکوز کی گئی ہو، اپنی مثال آپ ہے۔ اس سے قبل شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ رفیع الدینؒ کے ترجمے مستند ہونے کے باوجود سلیس اور جان دار نہیں تھے، بالکل لفظی ترجمے ایک ایسی قدیم زبان میں تھے جو اب بڑی حد تک متروک ہو چکی ہے۔ مولانا محمود حسنؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ترجمے بھی آج کی شستہ ورفتہ زبان میں نہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد کے یہاں اردو محاورات پر اتنا زور ہے کہ عربی محاورات کے حقیقی مضمرات بعض اوقات مجروح ہو جاتے ہیں۔ حافظ فتح محمد جالندھری کا ترجمہ با محاورہ، معتبر اور رواں ہے، مگر بہ کثرت تشریحی قوسین کے باوجود، جن کے سبب بعض اوقات عبارت پیچیدہ ہو جاتی ہے، اصل عربی کے تمام مضمرات واشارات کا جامع نہیں۔ اور اس کے استناد کی بھی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی اپنے ترجمۂ قرآن میں کچھ تو بعض قدیم اسالیب بیان اور کچھ اپنے طرزِ خاص کی الجھنوں میں گرفتار ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا ترجمۂ قرآن مذکور بالا تراجم سے بدرجہا بہتر ہے، مگر مکمل نہیں ہے۔

تفہیم القرآن میں تفسیر کے نمونے حسبِ ذیل ہیں:

"یعنی جن لوگوں کے سامنے روشنی پیش کی جائے اور وہ اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیں، جنھیں راہ راست کی طرف دعوت دی جائے اور وہ اپنے ٹیڑھے راستوں پر

چلتے رہنے کو ترجیح دیں، ان کے لیے اللہ کا قانون یہی ہے کہ پھر انھیں تاریکی ہی اچھی معلوم ہونے لگتی ہے۔ وہ اندھوں کی طرح ٹٹول ٹٹول کر چلنا اور ٹھوکریں کھا کھا کر گرنا ہی پسند کرتے ہیں۔ ان کو جھاڑیاں ہی باغ اور کانٹے ہی پھول نظر آتے ہیں۔ انھیں ہر بدکاری میں مزا آتا ہے، ہر حماقت کو وہ تحقیق سمجھتے ہیں، اور ہر فساد انگیز تجربہ کے بعد اس سے بڑھ کر دوسرے فساد انگیز تجربے کے لیے وہ اس امید پر تیار ہو جاتے ہیں کہ پہلے اتفاق سے دہکتے ہوئے انگارے پر ہاتھ پڑ گیا تھا تو اب کے لعلِ بدخشاں ہاتھ آجائے گا۔" (تفہیم القرآن جلد اوّل، ص:۵۷۸)

"ہواؤں کی گردش سے مراد مختلف اوقات میں زمین کے مختلف حصوں پر اور مختلف بلندیوں پر مختلف ہوائیں چلنا ہے جن سے موسموں کی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ دیکھنے کی چیز صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ زمین کے اوپر ایک وسیع کرۂ ہوائی پایا جاتا ہے جس کے اندر وہ تمام عناصر موجود ہیں جو زندہ مخلوقات کو سانس لینے کے لیے درکار ہیں، اور ہوا کے اسی لحاف نے زمین کی آبادی کو بہت سی آفاتِ سماوی سے بچا رکھا ہے۔ اس کے ساتھ دیکھنے کی چیز یہ بھی ہے کہ یہ ہوا محض بالائی فضا میں بھر کر نہیں رہ گئی ہے بلکہ وقتاً فوقتاً مختلف طریقوں سے چلتی رہتی ہے۔ کبھی ٹھنڈی ہوا چلتی ہے اور کبھی گرم۔ کبھی بند ہو جاتی ہے اور کبھی چلنے لگتی ہے۔ کبھی ہلکی چلتی ہے تو کبھی تیز، اور کبھی آندھی اور طوفان کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ کبھی خشک ہوا چلتی ہے اور کبھی مرطوب۔ کبھی بارش لانے والی ہوا چلتی ہے اور کبھی اس کو اڑا لے جانے والی چل پڑتی ہے۔ یہ طرح طرح کی ہوائیں کچھ یونہی اندھادھند نہیں چلتیں بلکہ ان کا ایک قانون اور ایک نظام ہے جو شہادت دیتا ہے کہ یہ انتظام کمال درجہ حکمت پر مبنی ہے اور اس سے بڑے اہم مقاصد پورے ہو رہے ہیں۔ پھر اس کا بڑا گہرا تعلق اس سردی اور گرمی سے ہے جو زمین اور سورج کے درمیان بدلتی ہوئی مناسبتوں کے مطابق گھٹتی اور بڑھتی رہتی ہے، اور مزید براں اس کا نہایت گہرا تعلق موسمی تغیرات اور بارشوں کی تقسیم سے بھی ہے۔ یہ ساری چیزیں پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ کسی اندھی فطرت نے اتفاقاً یہ سب انتظامات نہیں کر دیے ہیں، نہ سورج اور زمین اور ہوا اور پانی اور نباتات اور حیوانات کے الگ الگ مدبر ہیں، بلکہ لازماً ایک ہی خدا ان سب کا خالق ہے اور اسی کی حکمت نے ایک

مقصد عظیم کے لیے یہ انتظام قائم کیا ہے، اور اسی کی قدرت سے یہ پوری باقاعدگی کے
ساتھ ایک مقرر قانون پر چل رہا ہے۔''

(تفہیم القرآن جلد چہارم، ص:۵۸۱-۵۸۲)

پہلا اقتباس قبل دیے گئے سورۂ الانعام کی آیت ۱۲۲ کے ترجمے پر ایک تفسیری نوٹ ہے۔ اس نوٹ میں فکر انگیز معنوی تشریح کے ساتھ ادب کی جو چاشنی اور خوب صورتی ہے وہ تشریح کے تاثر میں بہت اضافہ کرتی ہے۔ ٹٹول ٹٹول کر چلنا اور ٹھوکریں کھا کھا کر گرنا۔ کھڑی بولی کے افعال کی طلسم آفریں تصویر پیش کرتا ہے تو ''جھاڑیاں ہی باغ اور کانٹے ہی پھول'' کا استعارہ ایک سحر انگیز پیکر ترتیب دیتا ہے، جب کہ ''دہکتے ہوئے انگارے'' اور ''لعلِ بدخشاں'' کا تقابل ''ہاتھ پڑ گیا تھا'' اور ''ہاتھ آجائے گا'' کے فقروں میں ہاتھ کے مختلف محاورات کے ساتھ مل کر بیان میں ایک ''جادو اثر'' کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔

دوسرا اقتباس قبل درج کیے ہوئے سورۂ الجاثیہ کی آیت ۵ کے ترجمے کی تفسیر ہے، جس میں صرف ''ہواؤں کی گردش'' کا ایسا زبردست حکیمانہ تجزیہ اتنے شاندار ادبی انداز سے کیا گیا ہے کہ قاری کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی چیز عقل وفکر کو تسخیر کرتی ہوئی قلب وجگر تک اترتی چلی جارہی ہے۔ قرآن کی اس موثر اور دل کش ترجمانی کو دیکھ کر واقعی ''روح وجد میں آتی ہے۔'' ہوا کی قسموں کی یہ تفصیل کہ ''کبھی ٹھنڈی ہوا چلتی ہے اور کبھی گرم، کبھی بند ہو جاتی ہے اور کبھی چلنے لگتی ہے، کبھی ہلکی چلتی ہے تو کبھی تیز، اور کبھی آندھی اور طوفان کی شکل اختیار کر لیتی ہے، کبھی خشک ہوا چلتی ہے اور کبھی مرطوب، کبھی بارش لانے والی ہوا چلتی ہے اور کبھی اس کو اڑانے والی چل پڑتی ہے۔'' موضوع بحث کی ایک ایک گرہ کھول کر ذہن کو مطمئن کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی ''تیز وتند اسپرٹ'' سے اہل اردو کے دلوں کو ''گرمانے اور نرمانے میں'' بھی کامیابی حاصل کرتی ہے۔ اس تفصیل میں عربی وفارسی کے محض چند اسما کھڑی بولی کے کثیر افعال کے ساتھ نہایت چابک دستی سے استعمال کیے گئے ہیں۔ ایک جگہ بارش کے بہ جائے ''بارشوں'' کا صیغۂ جمع انگریزی محاورے کے (Rains) کا ایسا چست ترجمہ ہے کہ اردو عبارت میں پوری طرح تحلیل ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ہندستانی قاعدے پر ''بارشوں'' کی جمع عربی قاعدے پر ''تغیرات'' کی جمع کے ہم راہ استعمال کی گئی ہے۔ یہ مختلف لسانی وسائل کا تال میل اپنے سیاق وسباق کے لیے بالکل موزوں ہے

اور ''روانیِ عبارت''اور''زورِبیان'' کے علاوہ''بلاغتِ زبان''اور''تاثیرِ کلام'' کا باعث بھی۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ تفہیم القرآن جلد اوّل کے دیباچے میں مولانا مودودی نے کلام الٰہی کی عربی مبین کی ترجمانی اپنی اردوے مبین میں کرنے کا جو تہیہ اور عزم کیا تھا اسے انھوں نے تفسیرِ قرآن کی چھ ضخیم جلدوں میں بڑے شرح وبسط اور زور وقوت کے ساتھ پورا کر دکھایا۔ قرآن مجید کے عالی قدر مضامین کو ادب کی تیز وتند اسپرٹ میں ادا کر کے مولانا نے ایک بے مثال علمی وادبی کارنامہ انجام دیا ہے، جو اردو زبان میں حکیمانہ موضوعات پر عالمانہ بحث ونظر اور نثری اسلوبِ بیان دونوں کا بہترین شاہ کار ہے۔ یہ شاہ کار مولانا کے کمالِ علم کے ساتھ ساتھ اظہار وابلاغ پر ان کی مکمل دست رست کا نمایاں ترین نمونہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کے سب سے بڑے صحیفے کی آیات نے اس صحیفے کے ساتھ از حد شغف رکھنے والے ایک عظیم انسانی ذہن کی تخلیقی صلاحیت کو پوری طرح بیدار کر دیا ہے اور وہ اپنے نطق کی جملہ استعداد سے کام لے رہا ہے۔ نہ صرف یہ کہ ''الجہاد'' سے طرزِ مودودی کا جو ارتقا شروع ہوا تھا وہ ''تفہیم القرآن'' پر ختم ہوا، بلکہ پہلی اہم تصنیف پر ہی قرآن کے اسلوب کا جو پرتو پڑا وہ آخری اہم ترین تصنیف میں مکمل ہو گیا۔ اردو عربی کا آئینہ بن گئی۔

طرزِ مودودی کا تقابلی مطالعہ

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے طرزِ تحریر کے تجزیے کے بعد پیش رو ادیبوں کے اسالیب بیان کے ساتھ اس طرز تحریر کا موازنہ بھی کسی تنقیدی فیصلے کے لیے ضروری ہے۔ مولانا مودودی کی ادبی خدمات کا صحیح اندازہ اسی تقابلی مطالعہ سے ہوگا۔ اردو نثر کی روایات کا ایک جائزہ قبل لیا جا چکا ہے۔ طرزِ مودودی کے ادبی اجتہادات انہی روایات کے پس منظر میں ہیں۔ لہٰذا ان اجتہادات کی قدر و قیمت اور اہمیت کا تعین اسی وقت ہوگا جب روایات کے کچھ نمونے بھی پیشِ نظر ہوں۔ چنانچہ حسب ذیل سطور میں یہ نمونے بھی دیے جا رہے ہیں۔

سر سید

''توریت و انجیل میں آنے والے پیغمبر کی بشارتیں ایسی مہمل اور مجمل طور سے بیان ہوئی ہیں کہ پہیلی اور معمے کی مانند ہوگئی ہیں۔ اور جب تک ان کی تشریح نہ کی جاوے اور ان کا حل نہ بتایا جاوے تو ان کا مطلب ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ پس اگر ہم یکا یک جناب پیغمبرِ خدا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارتوں کو بیان کرنا شروع کر دیں تو ضرور بعض لوگوں کے دل میں خیال جاوے گا کہ یہ کیسی مجمل اور مشکل بشارت ہے۔ اس لیے اوّل ہم ان بشارتوں کا ذکر کرتے ہیں جو حواریوں کے کہنے کے مطابق عہدِ عتیق میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق آئی ہیں اور اس کے بعد اِن بشارتوں کو لکھیں گے جو توریت اور انجیل میں جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت آئی ہیں۔''
(ص: ۵۸۵ خطبات احمدیہ مطبوعہ نول کشور سٹیم پریس لاہور)

محمد حسین آزاد

"جب وہ صاحبِ کمال عالم ارواح سے کشورِ اجسام کی طرف چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے باغِ قدس کے پھولوں کا باغ سجایا جن کی خوشبو شہرتِ عام بن کر جہاں میں پھیلی اور رنگ نے بقائے دوام سے آنکھوں کو طراوت بخشی، وہ تاج سر پر رکھا گیا تو آب حیات اس پر شبنم ہو کر برسا کہ شادابی کو کملاہٹ کا اثر نہ پہنچے۔ ملک الشعرائی کا سکہ اس کے نام سے موزوں ہوا اور اس کے طغرائے شاہی میں یہ نقش ہوا کہ اس پر نظم اردو کا خاتمہ ہو گیا، چنانچہ اب ہرگز امید نہیں کہ ایسا قادر الکلام پھر ہندستان میں پیدا ہو۔" (آب حیات ص:۵۴۱-۵۴۲)

نذیر احمد

"اگر کہیں میری روٹی کا ٹھکانا لگ جائے تو میں تائب ہو جاؤں۔ جب تم نے نوکر رکھنے کا وعدہ کیا تو میں نے ان کو زبان دی، اور وہ ارادے کی ایسی پکی اور سچی تھی کہ فوراً میرے ساتھ ہو لی، اور پھر کس طرح پر کہ گہنا اور پاتا اور کپڑا اور لتا اور ساز و سامان یعنی بھرا بھرایا گھر سب کو لات مار کر جس طرح بیٹھی تھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے بے شک جھک مارا اور میرا بال بال خدا کا اور تمہارا گنہگار ہے، مگر جس دن سے چچا باوا تشریف لائے، تم میری ایک بات بتاؤ۔ اور یوں اگر تمہارے مذہب میں تو بہ کوئی چیز نہیں، اور ناحق بدگمان رہو تو تمھاری خوشی، بھلا تم نے چند روز تو اس بیچاری غریب کو دیکھا ہوتا۔ جو شخص آٹھوں پہر آنکھوں کے سامنے رہے، اس کا حال آج نہیں کل اور کل نہیں تو پرسوں ضرور کھلے گا، پر کھلے گا۔" (افسانۂ مبتلا ص ۱۵۶)

حالی

"بنگالی اخباروں میں سرسید کی اس کارروائی سے سخت ناراضی ظاہر کی گئی اور ان کے خلاف بڑے بڑے تلخ آرٹیکل لکھے گئے۔ سب سے بڑا اعتراض ان پر یہ کیا گیا کہ وہ ابتدا سے رپریزینٹیٹو اصول کے بڑے طرف دار رہے ہیں اور ان کی تمام اگلی تحریروں اور اسپیچوں سے پایا جاتا ہے کہ وہ رعایا کی آزادی کے بہت بڑے حامی ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ وہ انڈین نیشنل کانگریس پر جو ہندستان میں رپریزینٹیٹو اصول کے موافق عمل درآمد چاہتی ہے معترض ہیں؟"
(حیاتِ جاوید، اکادمی پنجاب لاہور، ۱۹۵۷، ص:۳۱۹)

شبلی

''عین اس وقت جب کہ معرکۂ کارزار گرم ہے، تیروں کا مینھ برس رہا ہے، تمام میدان لالہ زار بن گیا ہے، ہاتھ اور پاؤں اس طرح کٹ کٹ کر گر رہے ہیں، جس طرح موسم خزاں میں پتے جھڑتے ہیں، دشمن کی فوجیں سیلاب کی طرح بڑھی چلی آرہی ہیں، عین اس حالت میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دست دعا آسمان کی طرف بلند ہے، جنگ آور باہم نبرد آزما ہیں اور سر مبارک سجدہ نیاز میں ہے۔ معرکۂ بدر میں حضرت علیؓ عین شدتِ جنگ میں تین بار خبر لینے آئے اور ہر دفعہ دیکھا کہ وہ مقدس پیشانی خاک پر ہے، فوجیں تیروں کا مینھ برسا رہی ہیں اور لڑائی کا فیصلہ نہیں ہوتا، فاتح بے سلاح زمین سے مٹھی بھر خاک اٹھالیتا ہے، اور دشمن کی طرف پھینکتا ہے، دفعۃً فوجوں کا بادل پھٹ کر مطلع صاف ہوجاتا ہے۔''

(سیرۃ النبی حصہ اوّل، مطبع معارف اعظم گڑھ، ص:۶۲۱)

مولانا ابوالکلام آزاد

''نوعِ انسانی کے دینی تصورات کا ایک قدیم عہد جو تاریخ کی روشنی میں آیا ہے مظاہرِ فطرت کی پرستش کا عہد ہے۔ اسی پرستش نے بہ تدریج اصنام پرستی کی صورت اختیار کی۔ اصنام پرستی کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مختلف زبانوں میں بہت سے الفاظ دیوتاؤں کے لیے پیدا ہوگئے اور جوں جوں پرستش کی نوعیت میں وسعت ہوتی گئی، الفاظ کا تنوع بھی بڑھتا گیا۔ لیکن چونکہ یہ بات انسان کی فطرت کے خلاف تھی کہ ایک ایسی ہستی کے تصور سے خالی الذہن رہے جو سب سے اعلیٰ اور سب کی پیدا کرنے والی ہستی ہے، اس لیے دیوتاؤں کی پرستش کے ساتھ ایک سب سے بڑی اور سب پر حکمراں ہستی کا تصور بھی کم و بیش ہمیشہ موجود رہا، اور اس لیے جہاں بے شمار الفاظ دیوتاؤں اور ان کی معبودانہ صفتوں کے لیے پیدا ہوگئے، وہاں کوئی نہ کوئی لفظ ایسا بھی ضرور مستعمل رہا جس کے ذریعے اس اَن دیکھی اور اعلیٰ ترین ہستی کی طرف اشارہ کیا جاتا تھا۔''

(ترجمان القرآن، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، جلد اوّل، اشاعت ۱۹۸۰ء، ص:۱۷)

سرسید کا اسلوب بیان بہت واضح ہے اور اس سے زیر بحث موضوع کے سب نکتے صاف صاف سامنے آجاتے ہیں، مگر عبارت میں ہمواری اور شستگی کی کمی ہے، طرز اظہار کچھ

قدیمانہ ہے، جس کے بعض اجزا اب متروک ہو چکے ہیں۔ یہی ناہمواری حالیؔ کے اسلوب میں بھی ہے، جس میں انگریزی الفاظ کے استعمال کی کثرت سے کچھ اضافہ ہو گیا ہے، گرچہ سادگی اور بے تکلفی کا عنصر نمایاں ہے۔ محمد حسین آزاد کی نثر شاعرانہ ہے اور اس میں انشا پردازی کے جوہر بڑے تکلف کے ساتھ دکھائے گئے ہیں، یہ اندازِ تحریر دل چسپ، رنگیں اور پُر لطف ہونے کے باوجود تصنع سے پاک نہیں۔ نذیر احمد کی سلیس نثر محاورات سے پُر ہے اور اس کا اپنا ایک خاص مزا ہے، لیکن اس کی یہ چاشنی ایک حد تک صرف افسانہ نگاری کے لیے موزوں ہو سکتی ہے، علمی یا کاروباری بڑے مقاصد کے لیے ایسی نثر اظہار مدعا میں رکاوٹ بن سکتی ہے اور کچھ غلط تاثرات بھی پیدا کر سکتی ہے، چناں چہ نذیر احمد کے ترجمۂ قرآن کے سلسلہ میں یہ بات کہی بھی گئی۔

شبلی کا اندازِ بیان بالکل سلیس، فصیح اور بلیغ ہے، اس کی چستی ہمواری اور استواری نثر کے مثالی طرزِ تحریر کا ایک نمونہ ہے، اس میں شستگی کے ساتھ شگفتگی بھی ہے، متانت کے ساتھ جودت بھی، شوکت کے ساتھ نفاست بھی۔ یہ ایک محکم نثر ہے، جس کی عمدگی، شائستگی اور وقار بہ یک وقت پُر لطف اور فکر انگیز ہے۔ اس اسلوب نگارش کا جوش و خروش سنجیدگی کی حدود میں ہے اور اس کی روانی طوفانی نہیں ہے۔ یقیناً اس میں کچھ لطیف جذبات شامل ہیں، مگر احساس کی یہ شدت ایک گہرے تفکر پر مبنی ہے۔ یہ طرزِ اظہار دماغ و دل دونوں کو اپیل کرتا ہے۔

ابوالکلام آزاد کے اسلوب بیان میں شبلی کا انداز تحریر نمایاں ہے۔ اس کی حرکیت ایک منطق کے پیچ و خم کھولتی ہے۔ اس کی خطابت متانت سے خالی نہیں۔ اس میں شوکت کے ساتھ ساتھ صلابت ہے۔ انشا پرداز نے بڑی صراحت اور نفاست کے ساتھ اپنے مدعا کا اظہار کیا ہے۔ چند سطروں میں ایک اہم حقیقت نہایت معقول طریقے سے واضح کی گئی ہے۔ یہ ایک حکیمانہ تبلیغ ہے، جس میں بحث کے خاص نکات کا ابلاغ پورے زور سے، موثر طور پر ہوا ہے۔ الفاظ کے آہنگ میں اعتماد کی کیفیت سے استناد کا رنگ پیدا ہوتا ہے۔

ابوالاعلیٰ مودودی کا طرز تحریر پیش رو اساتذۂ نثر کے اسالیب کی ارتقائی شکل ہے اور ان کے تصنیفی کمالات کا جامع۔ اس میں سرسید کے اسلوبِ بیان کی وضاحت و صراحت، حالیؔ کے انداز کی سادگی و بے ساختگی، نذیر احمد کی برجستگی، محمد حسین آزاد کی شگفتگی، شبلی کی ہمواری و استواری اور ابوالکلام آزاد کی طرفگی و رعنائی جیسے وہ تمام عناصر موجود ہیں جو ایک اچھی، کارآمد اور پُر اثر نثر

کے اجزاے ترکیبی سمجھے جاتے ہیں۔ اردو نثر کی روایات کے اس عمومی ورثے سے پوری طرح بہرہ یاب ہونے کے علاوہ طرزِ مودودی کی خصوصیات یہ ہے کہ اس نے شبلی اور ابوالکلام آزاد کے اسالیب کے علمی وادبی کمالات وفتوحات کی سرحدیں بڑھادی ہیں۔ ان میں توسیع واضافہ کیا ہے اور ان کی قوتوں کو بالفعل نقطۂ عروج تک پہنچادیا ہے۔ یہ مجموعی طور پر اردو کی ادبی نثر یا اس کے نثری ادب کا فروغ ہے۔

اس سلسلے میں طرز مودودی کا اہم ترین وصف یہ ہے کہ اس نے دقیق موضوع کو لطیف سے لطیف پیرایۂ بیان عطا کیا ہے جو حد درجہ ثقاہت کے باوجود ادنیٰ ثقالت سے بھی خالی ہے۔ زبردست تعقل اور تجزیے پر مشتمل یہ اسلوبِ نگارش قاری کے ذہن میں ایک انبساط، شادابی اور سرشاری پیدا کرتا ہے، اس کی تاثیر دماغ میں روشنی اور دل میں گرمی کی کیفیات ابھارتی ہے۔ ابلاغ کے اس انداز سے فکر کا اظہار اس طرح ہوتا ہے کہ وہ ایک نمونۂ فن بن جاتا ہے۔ اس اندازِ بیان کی سب سے امتیازی شان ربطِ کلام ہے۔ مولانا مودودی کی تحریروں میں عبارت اتنی مربوط و مرتب ہوتی ہے کہ اس میں کہیں کوئی رخنہ یا شگاف نظر نہیں آتا۔ مولانا کا منظم ذہن اپنے خیالات کی تنظیم گویا ایک نغمے کی طرح کرتا ہے۔

دینیات، اخلاقیات، سیاسیات اور معاشیات کے متنوع مضامین کو مولانا مودودی کے طرزِ تحریر نے جس کثرت ووسعت، گہرائی اور بلندی کے ساتھ اپنے مقالوں، کتابوں اور خطبوں میں پیش کیا ہے وہ ایک منفرد کارنامہ ہے۔ وہ یکساں اعتماد کے ساتھ ہر قسم کے موضوعات کے تمام مضمرات وجہات کا احاطہ جس چابک دستی سے کرتے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس سلسلے میں مولانا مودودی کے زرخیز ذہن کا علمی وفور جس بشاشت وطلاقت کے ساتھ ایک ادبی قالب میں ڈھل گیا ہے اس کی نظیر مشکل ہی سے ملے گی۔ مولانا کی تحریروں کا حجم ان کے وزن کے ساتھ مل کر بے مثال بن جاتا ہے۔

مولانا مودودی کا ادبی مقام

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اردو میں علم و ادب کی انہی شان دار روایات کو فروغ دیا ہے جن کی بنا علمائے دین اور صوفیائے کرام نے صدیوں پہلے اس وقت ڈالی تھی جب برصغیر میں عربی و فارسی اور پراکرتوں کے تال میل سے ایک نئی زبان کا خمیر اٹھ رہا تھا اور جس کی تشکیل و تعمیر میں خانوادۂ شاہ ولی اللہ اور تحریک مجاہدین نے ایک نمایاں رول ادا کیا، یہاں تک کہ انیسویں صدی میں سرسید، محمد حسین آزاد، نذیر احمد، حالی اور شبلی جیسے فضلائے اردو کی علمی نثر کو ایک سانچے میں ڈھال دیا، خاص کر شبلی نے دین، علم اور ادب کی ہم آہنگی سے اردو کے بہترین نثری اسلوب کی آبیاری کی اور ان کے بعد ابوالکلام آزاد نے چند تجربات کے بعد بالآخر اسی اسلوب کو ترقی دینے کا تہیہ کیا۔ اردو کے نثری ادب کے ارتقا کی اس سنہری زنجیر کی آخری کڑی ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریریں ہیں۔

چنانچہ مختلف اسالیبِ بیان کے درمیان طرز مودودی کی مشابہت سب سے زیادہ شبلی اور ابوالکلام کے اندازِ تحریر سے ہے، اس لیے کہ عصر حاضر میں نشاۃ ثانیہ اور اصلاح کی جو قاموسی مہم شبلی اور ابوالکلام آزاد جیسے عبقریوں اور دانش وروں نے شروع کی تھی اس کی تکمیل ابوالاعلی مودودی نے کی۔ اردو میں دانش وری کی روایت کے سب سے مضبوط ستون یہی تین افراد ہیں اور ان کی ذہنی و عملی فتوحات نے اردو نثر کو ادب کے جواہر پاروں سے مالا مال کر دیا ہے۔ اس ثروت مندی کی بدولت اردو زبان دنیا کی بڑی سے بڑی قدیم و جدید زبانوں کی ہم پلّہ بن گئی ہے۔ مسائلِ حاضرہ پر اس وقت اسلامی لٹریچر کا جو ذخیرہ اردو زبان میں ہے وہ عربی و فارسی میں بھی نہیں اور پچھلی دو صدیوں میں مستشرقین نے مغربی زبانوں میں اسلامیات پر مہارت کا جو

ڈھونگ رچایا تھا اس کی قلعی سب سے زیادہ اردو ہی میں لکھنے والے علماء نے کھولی ہے۔

لیکن طرز مودودی اور شبلی و آزاد کے اسالیب میں ایک فرق ہے اور وہی طرز مودودی کے لیے وجہ امتیاز ہے۔ شبلی اور ابوالکلام آزاد دونوں اپنی نثر میں بعض اوقات شاعری یا شاعرانہ خطابت کی طرف مائل نظر آتے ہیں، جب کہ مودودی اپنی تبلیغی کوششوں میں انتہا پر بھی صرف نثر، منظّم اور متین نثر، کا جادو جگاتے ہیں، ان کے بیان کی زرینی میں رنگینی کم ہی ہوتی ہے اور ان کا جوش بیان مبالغے کے بہ جائے منطق پر مبنی ہوتا ہے۔ ان کے اندازِ تحریر میں تیزی وتندی اور قوت کے تمام مظاہر ایک زبردست نظم وضبط کے ساتھ رُونما ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ طرز مودودی کی پُرکاری میں سرسید اور حالی کی سادگی بھی شامل ہے۔

اس کیفیت سے مولانا مودودی کے ادبی مقام کی وضاحت ہوتی ہے۔ یہ نثری ادب میں وہی مقام ہے جو شاعری میں اقبال کو حاصل ہے، جس طرح اردو کی بہترین شاعری اقبال نے کی ہے۔ اسی طرح بہترین نثر مولانا مودودی نے لکھی ہے۔ وہ یقیناً اردو کے سب سے بڑے نثار، اسی طرح ہیں جس طرح اقبال سب سے بڑے شاعر۔ یہی وجہ ہے کہ تربیتِ شعور اور تحریک عمل کا جو کارنامہ اقبال کی شاعری نے انجام دیا وہی مولانا مودودی کی نثر نے بھی۔ چنانچہ یہ واقعہ بلاوجہ نہیں ہے کہ اقبال کے پسندیدہ نظریۂ حیات اور نظام زندگی کی نہ صرف توضیح وتشریح بلکہ تعمیل وتکمیل بھی مولانا مودودی ہی نے کی اور جو چیز شاعری میں صرف ایک تحریک تھی اسے ان کی نثر نے ایک تنظیم بنادیا۔ اقبال کے فکری اشارات کی تفصیل مولانا مودودی کے لٹریچر میں بہ درجۂ کمال موجود ہے۔

اس عظیم الشان اور فقید المثال لٹریچر کے اسلوبِ بیان کی ادبی خصوصیات حسب ذیل ہیں:

۱- اعتماد

یہ علم کا ثمر ہے۔ مولانا مودودی کا مجتہدانہ ذہن اپنے وسیع وعمیق مطالعہ کی بدولت موضوعات بحث کا ایسا پختہ ادراک رکھتا ہے کہ وہ متعلقہ معاملے کے ہر پہلو پر پورے یقین واعتماد کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں۔ اسی اندازِ گفتگو سے ان کی تحریروں کا اعتبار قائم ہوتا ہے اور ان کے قارئین کے دل ودماغ روشن ہوتے ہیں۔ یہ بصیرت وجرأت اور عقل وایمان کے مکمل امتزاج کا ہی نتیجہ ہے کہ مولانا کے بیانات میں وضاحت کے ساتھ قطعیت بھی پائی جاتی ہے۔

۲-وقار

لیکن اس قطعیت میں سطحیت نہیں ہے۔ یہ پروپیگنڈے کا کوئی سستا اور کھردرا ہتھکنڈا نہیں ہے، نہ اس میں کوئی کف دردہاں وعظ و پند ہے۔ اس کی سنجیدگی ایک سوچے سمجھے نقطۂ نظر پر مبنی ہے اور طمانیت و تمکنت کا باعث ہے۔ اس کے اندر شوکت کا احساس اس کی صلابت کے سبب ہے۔ اس کا شاہانہ وقار انسان سازی اور حق شناسی کی اس تحریک کا اشاریہ ہے جو بہ حیثیت مصنف مولانا مودودی کا مطمحِ نظر ہے۔

۳-رعنائی

طرزِ مودودی کی روانی و شگفتگی بہ یک وقت صباحت وملاحت کے جلوے ابھارتی ہے۔ روشن الفاظ، روشن ترکیبیں، روشن تصویریں اور روشن محاورے اس طرز کے اندر ایک جمالیاتی احساس پیدا کرتے ہیں۔ یہ حسنِ ادا اور رعنائی بیان کی بہترین مثال ہے۔ اس اسلوب میں فنِ بدیع کے نقوش کا استعمال بے ساختہ ہوتا ہے۔ امثال تشبیہات، استعارات اور کنایات بہ قدرِ ضرورت اور بلاتکلف جز وعبارت بن جاتے ہیں۔

۴-برّاقی

مولانا مودودی کی تحریروں میں افکار کی برقی رو اس طرح چلتی ہے کہ ان کے جملوں اور فقروں میں بھی برّاقی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی حرارت ہے جس میں تپش اور تمازت سے زیادہ نورانیت کا احساس ہوتا ہے۔ اس سے نہ صرف قاری کے اعصاب متاثر ہوتے ہیں، بلکہ اس کا ذہن بھی متاثر ہوتا ہے۔ آدمی چونک اٹھتا ہے اور اس کے دماغ میں کرنیں سی چمکنے لگتی ہیں، رگ و پے میں بجلی سی دوڑنے لگتی ہے اور وہ ایک جذبے سے سرشار ہو جاتا ہے، اس کا حوصلہ بلند ہونے لگتا ہے اور عزم راسخ۔

۵-چاشنی

طرزِ مودودی کی تیزابیت سرکہ جینی کی مرہونِ منت نہیں۔ یہ قدرے شیرینی اور قدرے ترشی سے ابھرنے والی چاشنی ہے۔ اسی لیے اس میں تلخی نہیں، تندی ہے۔ طنز و مزاح کا جو عنصر مولانا مودودی کی تحریروں میں ہے اس پر ظرافت غالب ہے، جو ایک مجموعہ ہے دانائی و خوش طبعی کا۔

اس میں ایک شائستگی ہے جو سخت سے سخت تنقید کو بھی گوارا بناتی ہے۔ اس کا مزا کڑوا کسیلا نہیں کھٹا میٹھا ہے، اس سے زبان کا ذائقہ خراب نہیں ہوتا، کچھ تیز ہو جاتا ہے، گویا انگریزی محاورے میں زبان کی کلیاں کھلنے لگتی ہیں۔

۶-مضبوطی

مولانا مودودی کے اسلوب بیان میں نظم وضبط کے ساتھ قوت وطاقت بھی ہے، یہ ایک سلیقۂ ترتیب ہے جو عبارت کو سجل اور سڈول بناتا ہے۔ اس میں شور نہیں، زور ہے، کرختگی نہیں، پیوستگی ہے۔ طرزِ مودودی میں ہمواری واستواری کا راز یہی ہے۔ یہ ایک جان دار اندازِ تحریر ہے اور شاندار بھی۔ صحت مند خیالات اور صالح افکار ایک مضبوط وموثر طرز نگارش میں بروئے اظہار آتے ہیں۔

۷-صفائی

مولانا مودودی کی ہر تحریر صاف ستھری ہوتی ہے، حشو وزوائد اور متروکات سے پاک صاف، ہر قسم کے ایہام وابہام سے خالی۔

۸-تازگی

اس تحریر میں ایک تازگی ہے، اس میں قدیم یا قدیمانہ انداز ادا کی بوسیدگی وفرسودگی کا نشان نہیں ملتا۔ یہ اپنے وقت کے مروجہ محاورات پر مشتمل ہے۔

۹-چستی

مولانا مودودی کسی جدّت کے چکر میں پراگندگی، ژولیدگی اور معمگی کو پسند نہیں کرتے۔ وہ ہر بات سیدھے سادے طریقے پر، چستی اور برجستگی کے ساتھ کرتے ہیں۔ ان کا انداز بیان ڈھیلا ڈھالا نہیں، کسا گٹھا اور چست ہوتا ہے۔ وہ نہ تو نامانوس اور اجنبی الفاظ سے قارئین کو پریشان کرتے ہیں، نہ عبارت میں کوئی جھول روا رکھتے ہیں۔

۱۰-زیبائی

چستی کے ساتھ موزونی بھی طرز مودودی میں نمایاں ہے۔ وہ الفاظ کا استعمال موقع کے مطابق کرتے ہیں اور اگر کسی غیر زبان مثلاً انگریزی کے الفاظ یا اصطلاحات ان کی عبارت

میں آئی بھی ہیں تو وہ ان کو اردو مترادفات کے ساتھ ساتھ درج کرتے ہیں، دوسرے یہ کہ درحقیقت وہ اردو میں مستعمل و مروج اور معروف و مسلم الفاظ وتراکیب کو ہی اصلاً استعمال کرکے گویا ان کے ترجمے یا ان کی تشریح کے طور پر اجنبی زبان کے الفاظ وتراکیب کا اندراج جدید تعلیم یافتہ قارئین کی سہولت کے لیے کرتے ہیں۔ یہ تحریر کی زیبائی ہے۔

۱۱-حرکیت

مولانا مودودی اپنی بحثوں میں کبھی دفاعی یا عذر خوابانہ (Defensive or Apologetic) انداز اختیار نہیں کرتے۔ ان کا طریقِ کار اقدامی اور حرکی (Initiative and dynamic) ہے۔ یہ درحقیقت ایک تحریکی انداز ہے۔ چنانچہ طرزِ مودودی میں افعال بہ کثرت استعمال کیے جاتے ہیں اور عربی و فارسی مصادر کے علاوہ کھڑی بولی کے الفاظ سے بھی اکثر کام لیا جاتا ہے، جس کے سبب عبارت میں بڑی تاثیر پیدا ہو جاتی ہے۔

۱۲- تفہیم

مولانا مودودی کے اسلوب کا امتیازی نشان ایک لفظ میں تفہیم سے ظاہر کیا جاسکتا ہے۔ یہ ایک ایسی تبلیغ ہے جو پوری معقولیت کے ساتھ لوگوں کو صرف سمجھانا چاہتی ہے کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا، مفید کیا ہے اور مضر کیا؟ مولانا کی تحریروں میں شرح وبسط اور ربط وارتباط کا مقصود یہی افہام وتفہیم ہے۔ اسی مقصد کے لیے انھوں نے تفہیمات وتنقیحات اور سب سے بڑھ کر تفہیم القرآن کی مہم سرانجام دی۔ ان کے ترجمۂ قرآن کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عربی الفاظ کے تمام معانی و مضمرات سیاق وسباق کے لحاظ سے اردو الفاظ میں بڑے دبیز و بلیغ انداز سے ادا کیے گئے ہیں، جس سے اردو زبان کی قوتِ اظہار کا سراغ ملتا ہے۔ اس سراغ سے اردو ادب کی ثروت کا ثبوت بھی بہ خوبی فراہم ہوتا ہے۔ طرز مودودی کو ایک جملے میں بیان کریں تو وہ ایک ایسا منطقی واستدلالی اسلوب ہے جس میں زبان وبیان کی فصاحت وبلاغت سے تبلیغ کا حق ادا ہوگیا ہے اور ابلاغ کے اس کمال ہی نے ایک بہترین ادب کی تخلیق کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو میں علمی نثر کے ارتقا کی تکمیل مولانا مودودی کے لٹریچر سے ہی ہوتی ہے، جس میں پیش رو علماو ادباء کے تجربات مرتکز ہو کر نقطۂ عروج تک پہنچ گئے ہیں۔ اس عروج سے زندگی آمیز اور زندگی

آموز ادب کا انتہائی فروغ ہوا ہے، جس کے وسیع اور دوررس اثرات کا بروقت پورا اندازہ لگانا اس لیے مشکل ہے کہ مولانا مودودی کی وفات پر ابھی صرف دس سال گزرے ہیں، پھر بھی یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ مولانا کی تحریروں نے ایک ایسے مکتب فکر کی تعمیر کی ہے جس کے تحت ایک مکتبِ ادب بھی پچھلی کئی دہائیوں سے وجود میں آچکا ہے۔

اقبال کی عظیم شاعری نے اردو ادب میں تفکر و تخلیق کی جو رو چلائی اور جس کے جلو میں اخلاقیات و جمالیات کی ہم آہنگی سے فکر و فن کی کامل پیوستگی اور ترقی ہوئی اس کی تشریح اور قدر شناسی اردو تنقید ابھی تک پورے طور سے نہیں کرسکی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے عہد اقبال میں اردو ادب کی تخلیقی اصناف نے کوئی خاص ترقی نہیں کی۔ لیکن فکری ادب کے دائرے میں مولانا مودودی کے کمالات نے علمی نثر کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ چنانچہ اردو ادب میں اقبال کے بعد فن کی پس ماندگی کے باوجود فکر کی ترقی نہیں رکی اور نثر کا ارتقا ہوتا رہا۔

اس ارتقا میں مولانا مودودی کی تحریروں کا جو حصہ ہے اسی سے مولانا کے ادبی مقام کی تعیین ہوتی ہے۔ بہ حیثیت ادیب مولانا کے کارنامے پر روشنی ڈالی جاچکی ہے اور طرزِ مودودی کے کمالات بھی دکھائے جاچکے ہیں۔ گزشتہ مباحث سے واضح ہوجاتا ہے کہ اردو نثر کی روایات میں مولانا مودودی کے تجربات نے کیا اضافہ کیا ہے۔ ان حقائق کے پیش نظر بلا تامل کہا جاسکتا ہے کہ اردو نثر میں مولانا مودودی سب سے بڑے ادیب ہیں۔ ادب میں مولانا کا یہ اعلیٰ مقام ان کی علمی و ادبی دونوں قسم کی خدمات پر مبنی ہے۔ ان کی دانش وری نے ایک خاص اسلوب بیان کو ترقی دی اور وہ حکیمانہ خیالات کے اظہار کا بہترین اسلوب ثابت ہوا۔